جون 2002

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

کیفی اعظمی
1919-2002

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا ڈیڑھ لاکھ روپے کا ادبی ایوارڈ اس سال پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دیا گیا۔
اراکینِ جیوری (بائیں سے) پروفیسر صادق، شہریار، ڈاکٹر صغرا مہدی اور جناب بلراج کومل

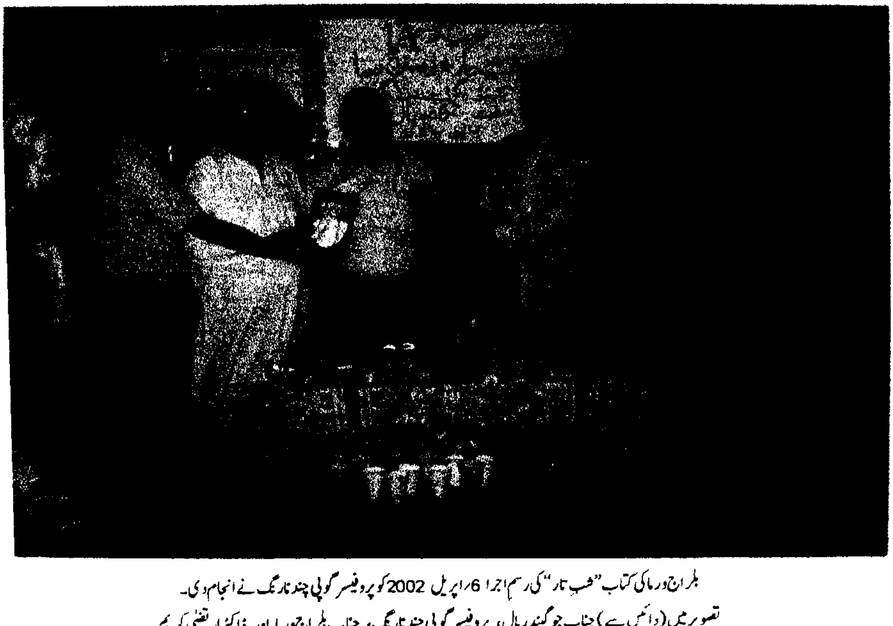

بلراج ورما کی کتاب "شبِ تار" کی رسم اجرا 6/اپریل 2002 کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجام دی۔
تصویر میں (دائیں سے) جناب جوگیندر پال، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب بلراج ورما اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

ماہنامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔4، شمارہ۔6: جون 2002

قیمت-/10روپے سالانہ -/100روپے

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
معاون مدیر: ارجمند آرا

مشیر محمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ تعلیم۔ حکومتِ ہند

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 6103938, 6103381
6179657 فیکس: 6108159
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.com
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد
دہلی۔110006

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون:6109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدر آباد 001 500 (A.P.)
فون:4615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
اقلیتی تعلیم کا منظر نامہ — ریاستِ کرناٹک میں (گیسٹ کالم) .... میر بدرالدین علی 6
● بہار اور جھارکھنڈ میں اردو آبادی .... اے آر فتکیہی 9
● ڈاکٹر ذاکر حسین اور اردو تعلیم .... محمد شاہد حسین 19
● اردو کی تعلیم اور ہماری نئی نسلیں .... ارتقا شیخ 22
● ملک کی معیشت میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی پیش رفت .... عبدالعلیم قدوائی 24
● خلائی تحقیقات میں ترقی .... وی۔ مادھون نائر 27
● برن آؤٹ سنڈروم .... اتم کمار 31

گوشۂ ادب
● آخری کامریڈ کیفی اعظمی .... گلزار 34
● روشنی کا مینار — کیفی اعظمی .... ارجمند آرا 35
● زندگی (نظم) .... کیفی اعظمی 36
● پس سخن .... کیفی اعظمی 38

گوشۂ فروغِ کتب
● ہندستانی گاؤں .... شیاما چرن دوبے 40
● میاں آزاد مترجم (فسانۂ آزاد جلد اوّل سے اقتباس) .... رتن ناتھ سرشار 44

طلبہ کے لیے
● نیا تعلیمی سال اور کیریئر کا انتخاب .... سلمان عابد 46
● مائکروسافٹ ورڈ .... عظیم صدیقی 48
● قدیم ہندستان (کوئز) .... محمد اخلاق آزاد 52

اُردو خبر نامہ .... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 72
● قدیم ہندستان کی تاریخ / رما شنکر ترپاٹھی .... مبصر: ملک راشد فیصل
● امراض الاطفال / حکیم خورشید شفقت اعظمی .... مبصر: فیروز عالم
● رات پشمینے کی / گلزار .... مبصر: مخمور سعیدی
● محقق غالب کالی داس گپتا رضا / مرتبین: محمد عارف، ثاقب صدیقی مبصر: شبنم آرا
● مشرقی ہند میں اردو نگر ناٹک / ڈاکٹر محمد کاظم .... مبصر: ایس۔ اے۔ رحمٰن
● ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں / سید سلیمان ندوی
● خوابوں کے مسیحا (افسانوی مجموعہ) / نعیم کوثر

بچوں کا گوشہ
● دریا کا گیت .... نیتا بیری 78

آپ کی بات

■ غلام نبی مومن، اسپیشل آفیسر فار اردو، ایم ایس بیورو آف ٹیکسٹ بکس، بال بھارتی سیناپتی باپٹ مارگ، پونہ-411004

"اردو دنیا" کا اپریل کا شمارہ دستیاب ہوا۔ "ہماری بات" کے تحت آپ نے ایک اہم معاملے کی طرف بروقت توجہ دلائی ہے۔ اردو والوں کو چاہیے کہ مرکزی حکومت کی "سب کے لیے ابتدائی تعلیم" کی مہم سے فائدہ اٹھائیں۔ گیسٹ کالم میں پرنسپل محمد اقرار حسین کا مضمون لائق توجہ ہے۔

اس سلسلے میں اطلاعاً عرض ہے کہ مہاراشٹر میں انگریزی میڈیم اسکولوں میں پہلی سے دسویں جماعت تک انگریزی بطور زبان اوّل اور مراٹھی بطور زبان دوم پڑھائی جاتی ہے۔ پانچویں جماعت سے تیسری زبان کے طور پر ہندی (100 مارکس) یا ہندی + اردو (50-50 مارکس) پڑھائی جاسکتی ہے۔ اس فارمولے کے تحت مہاراشٹر کے کئی انگریزی میڈیم اسکولوں میں پانچویں جماعت سے اردو (کمپوزٹ کورس کے طور پر) پڑھائی جارہی ہے۔ ایس سی ای آر ٹی (پونہ) نے اس کا نصاب تیار کیا ہے۔ نصاب سازی کی کمیٹی مسز نورالعین علی، بشیر احمد انصاری، محمد حسن فاروقی اور راقم پر مشتمل تھی۔ حکومت مہاراشٹر کی منظوری کے بعد مذکورہ نصاب کے مطابق ٹیکسٹ بک بیورو (پونہ) نے "تعارف اردو" نامی درسی کتاب تیار کی ہے۔

دیگر ریاستوں میں اس فارمولے کو حسب ضرورت ترمیم کے بعد اپنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہندی ریاستوں میں انگریزی (زبان اوّل)، ہندی (زبان دوم) اور اردو کو زبان سوم (100 مارکس) کے طور پر اختیار کرنا آسان ہے بلکہ ان ریاستوں میں اردو-عربی یا فارسی یا سنسکرت (50-50 مارکس) کو بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ اسی طرح مغربی بنگال میں انگریزی اور بنگلہ کے ساتھ ہندی-اردو (زبان سوم، 50-50 مارکس) پڑھا سکتے ہیں۔ اسی نمونے پر دیگر علاقائی زبانوں کی ریاستوں میں عمل کیا جاسکتا ہے۔ مہاراشٹر میں بعض مراٹھی میڈیم اسکولوں میں بھی مذکورہ نمونے پر اردو کی پڑھائی کا انتظام ہے۔

■ حلیمہ سعدیہ، ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد نگر، سنگم وہار، نئی دہلی

اردو دنیا (اپریل) کے گیسٹ کالم میں محمد اقرار حسین صاحب کا مضمون "انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم" کافی امید افزا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے کی طرف نشان دہی کی ہے کہ پبلک اسکولوں کے والدین خود یہ تعین نہیں کرپاتے کہ انھیں اپنے نور نظر کو اردو تعلیم دلانی ہے یا نہیں، اور دلانی بھی ہے تو کس حیثیت سے؟ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن میں یہاں آپ کی توجہ اس کے اسباب کی طرف مبذول کرانے کی جسارت کروں گی۔

سبھی والدین کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اعلیٰ سے اعلیٰ ترین اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ کچھ والدین کا یہ خواب آسانی سے پورا ہوجاتا ہے جبکہ کچھ ایسے بھی والدین ہیں جنھیں اس کے لیے کافی تگ ودو کرنی پڑتی ہے، اپنے اثر ورسوخ اور وسائل وذرائع کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کی طرف سے کیا گیا کوئی بھی مطالبہ نہ جانے کن معنوں میں لیا جائے گا اور اس کا ردِ عمل کیا ہوگا، کہیں داخلے کی منسوخی تک کی تو نوبت نہیں آجائے گی؟ یہ خوف انھیں ہر قسم کے مطالبے سے باز رکھتا ہے اور وہ اردو تعلیم کی بات زبان پر بھی نہیں لاتے۔

اس کے علاوہ ہمارے اکثر والدین اردو تعلیم کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کے سرے سے منکر ہیں۔ وہ اسے ایک غیر ضروری عمل اور طلبہ پر اضافی بوجھ گردانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے کسی مطالبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پبلک اسکولوں کے منتظمین داخلے کے وقت طلبہ کی مادری زبان دریافت کرلیں اور اگر کسی خاص زبان کے بولنے والے طلبہ دس یا اس سے زیادہ ہوں تو ان کی زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے یا تو تیسری زبان کی حیثیت سے یا پھر اضافی مضمون کی حیثیت سے۔ اگر کسی بچے کو اس کی مادری زبان سے بے بہرہ رکھا گیا تو یہ اس کے اوپر سراسر ظلم ہوگا اور اس ظلم میں والدین کے ساتھ ساتھ اسکول بھی برابر کے شریک ہوں گے۔ پبلک اسکولوں کے لیے پارٹ ٹائم ٹیچر رکھ کر کسی خاص زبان کی تعلیم دلانا کچھ مشکل کام نہیں۔ لیکن اگر وہ والدین کے مطالبے کا انتظار کرتے رہے تو شاید بہت دیر ہوجائے گی۔ مادری زبان کی تعلیم کو فروغ دینا ہر ہندستانی کا فرض ہے۔ امید ہے پبلک اسکولوں کے انتظامیہ اس پر غور کریں گی۔

■ شاغل ادیب، زیب منزل، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدرآباد

"اردو دنیا" اپریل کے شمارے میں آپ کے گراں قدر اداریے کے ساتھ ساتھ اس کے بعد کے دو تین مضامین بھی اردو کے مسائل اور اس کی بقا وارتقا کے لیے بہترین تجاویز پیش کرتے ہیں۔ اداریے میں مذکورہ دسویں پانچ سالہ منصوبے میں بہتر اردو نصاب کی فراہمی کے لیے آپ کی شخصی توجہ

ہی موثر نفاذ اور ثمر آوری میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ "انگریزی میڈیم نظامِ تعلیم میں اردو" میں محمد اقرار حسین نے صحیح کہا ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم میں، جو مکمل طور پر پرائیویٹ سیکٹر کے پاس ہے، کسی بھی زبان یا کسی بھی مضمون کی گنجائش نکالنا سب سے آسان ہے۔ ہم اردو والوں کو اپنی نسل کے لیے اس جانب توجہ دینا ضروری ہے۔ راشد جمال فاروقی نے نو تشکیل شدہ ریاست اترانچل میں اردو کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں وہ حقائق پر مبنی ہیں اور دعوت فکر و عمل دیتی ہیں۔ بقیہ مضامین میں ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمن کا مضمون "چین میں تصوف" بھی معلوماتی اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ محترمہ ارجمند آرا کے مترجم مضمون "بزدلی کا ذر نہیں" کا اختتامیہ بڑا طنز آمیز ہے۔ اس ترجمے میں زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ گوشۂ ادب میں "اٹھارہ سو ستاون کی کہانی مرزا غالب کی زبانی" کی آخری قسط، اور گوشۂ فروغِ کتب کے دونوں مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ رشید الدین خان کے مضمون کے اقتباس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریاتی، عملی، اجتہادی اور مجاہدانہ کارناموں کا ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ادبی شہ پاروں کے حوالوں سے اچھا جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ اپنے حسنِ انتخاب اور کمالِ ادارت سے "اردو دنیا" کو واقعی خوب سے خوب تر بنا رہے ہیں۔

■ پروفیسر ساجدہ زیدی، پروفیسر آف ایجوکیشن،
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

"اردو دنیا" اور "فکر و تحقیق" برابر مجھے مل رہا ہے۔ اس عنایت کے لیے سپاس گزار ہوں۔ آپ اردو کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں اور یہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن کسی طرح اردو کو یوپی کے عام اسکولوں میں بحیثیت سیکنڈ لینگویج (جن کی مادری زبان ہے ان کے لیے) داخل کرانے کی کوشش کیجیے۔ جب تک نئی نسل اردو کو بحیثیت مادری زبان یا ثانوی زبان نہ پڑھے اردو کی ترقی صحیح معنوں میں ممکن نہیں۔

■ فیروز بخت احمد، چیئرمین، فرینڈس فار ایجوکیشن،
A-202، ادیبہ مارکیٹ، مین روڈ ذاکر باغ، نئی دہلی-25

اردو کونسل سے میرا تعلق برسوں کا ہے۔ ایک وقت آپ کے آنے سے قبل یہاں یہ حالت تھی کہ دفتر میں کوئی کام کرتا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ نہایت ہی غیر متوقع طور پر آپ نے جس رفتار کے ساتھ کام کیا، اس سے تمام لوگ حیران ہو گئے۔ کچھ نے یہ بھی سوچا کہ چلو حمید اللہ بھٹ کا یہ نیا نیا شوق ہے اور سال چھ مہینے میں ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ عام طور سے اردو اداروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر جس برق رفتاری سے آپ نے پہلے دن کام شروع کیا، اسی رفتار سے اور اسی راستے پر آپ کو اردو طبقے نے گامزن دیکھا۔ کونسل کے مردہ ڈھانچے میں آپ نے جو جان پھونکی ہے، اس کی بدولت آج یہ ڈھانچہ ایک صحت مند جسم میں تبدیل ہو چکا ہے اور آپ ہی کی طرح تیز رفتاری سے ترقی کے راستے پر دوڑ رہا ہے۔ اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے عہدے سے آپ ایک دن سبکدوش ہو جائیں گے مگر جانے سے پہلے اپنے پیچھے وہ کام چھوڑ جائیں گے جس پر آنے والی نسلوں کو اور اردو زبان کو فخر ہوگا۔

آپ کے ذریعے جاری کردہ ماہنامہ "اردو دنیا" کی مسلسل طباعت ہی اتنا بڑا کام ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیا یہ چھوٹی بات ہے کہ آپ نے اردو کو مین اسٹریم سے جوڑا ہے؟ اردو کو آج آپ جیسے جیالوں کی ضرورت ہے کہ جنھوں نے اس زبان کو اہلِ اقتدار کے درمیان لا کھڑا کیا ہے۔ اردو زبان میں بھارت کے آئین کا نیا ایڈیشن وزیرِ اعظم ہند کے ہاتھوں جاری کرانا آپ جیسے ہی مردِ مجاہد کا کام ہے۔ سچ جانیے تو اردو کے دیوانوں کی یہی دعا ہے کہ تادمِ حیات بھٹ صاحب اس ادارے کی سرپرستی و رہنمائی کرتے رہیں۔ اردو کے لیے آپ کے ذریعے چھوڑی گئی Legacy پر ہمیں ناز ہے۔

■ ڈاکٹر ظفر حیدری، شعبۂ صحافت، کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر

"اردو دنیا" کے اپریل 2002 کے شمارے میں عبدالنور شبلی کا مضمون "صحافت میں کیریر" راقم الحروف کی نظر سے گزرا۔ مضمون کے آخر میں صحافت کی تعلیم دینے والی یونی ورسٹیوں کی ایک فہرست درج کی گئی ہے جس میں بدقسمتی سے کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ غالباً مصنف اس بارے میں ناواقف ہوں گے۔

راقم پچھلے دس برسوں سے کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت میں بحیثیت لکچرر خدمت انجام دے رہا ہے۔ میری کوششوں کے باعث اردو صحافت کا کورس یہاں شروع ہوا۔ اس سلسلے میں جناب ناصر مرزا، ریڈر، شعبۂ صحافت کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے شعبے میں اردو صحافت کو رائج کرنے میں انتھک کوششیں کیں۔ اردو صحافت کی منظوری بورڈ آف اسٹڈیز (Board of Studies) کے ماہرین نے دی۔

اردو صحافت کو فی الحال آپشنل (Optional) کورس کا درجہ دیا گیا ہے تاکہ وہ طلبہ جو اردو صحافت میں اپنا کیریئر (Career) بنانا چاہتے ہیں، اس کورس سے استفادہ کر سکیں۔ ایم اے ماس کمیونیکیشن اینڈ

جرنلزم کے دو سالہ ڈگری کورس کے پہلے سال میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان میں ریڈیو پروڈکشن، ایڈورٹائزنگ، رپورٹنگ اور کیونیکشین اینڈ ریسرچ قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے سال کے مضامین میں ٹیلی ویژن پروڈکشن، ایڈیٹنگ، فوٹوگرافی اور اردو جرنلزم شامل ہیں۔

میڈیا ٹائمز (Media Times) کے نام سے شعبہ ہر سال انگریزی میں ایک جریدہ شائع کرتا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے اس جریدے میں اردو صحافت کے باب کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کو بھی فروغ حاصل ہو۔

■ **انور ادیب، ابراہیم منزل، مغربی بنگال، آسنسول-713302**

"اردو دنیا" مارچ 2002 میں آپ نے "ہماری بات" میں جو نکات پیش کیے ہیں وہ بے حد اہم ہیں۔ اردو دوستوں کو اس سلسلے میں موثر اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب آل احمد سرور کا مضمون "اردو دوستوں سے ایک اپیل" اور جناب ابوالفیض سحر کا "اردو کی ترقی کے لیے ہم کیا کرسکتے ہیں" بے حد فکر انگیز ہیں۔ اردو دوستوں کو اپنا محاسبہ کرکے دیکھنا چاہیے کہ اردو کے سلسلے میں ہم کتنے غلط ہیں۔ اردو کی بقا و ترقی کی ذمے داری صرف حکومت پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر ہم نے اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی برتی اور صرف حکومت پر تکیہ کرتے رہے تو اردو کے کاز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کے مجرم ہوں گے۔

■ **بی ڈی کالیہ ہمدم، مکان نمبر 419، سیکٹر-12، پنچکولہ، ہریانہ**

"اردو دنیا" مسلسل مل رہا ہے۔ یہ آپ کے خلوص اور تہذیب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ میں اسکول کے وقت سے ہی اردو زبان و ادب سے وابستہ رہا ہوں۔ میں جہاں بھی گیا یا رہا، اردو کی محفلوں کا انعقاد کرتا رہا۔ فروغ اردو اور خاص کر شاعری کو عام آدمی تک پہنچانے میں مصروف رہا۔ خود کو کبھی ادیب یا شاعر نہ سمجھ کر اردو کا خدمت گزار کہلانے میں فخر محسوس کرتا رہا ہوں۔ اردو زبان و ادب کی موجودہ حالت پر کچھ تشویش بھی ہوتی ہے اور اس کے لیے کچھ لکھتا بھی ہوں۔ لیکن اب کچھ سوال اُبھر کر سامنے آرہے ہیں کہ کیا اُردو زبان اور تہذیب ہر ہندستانی کی ہے یا صرف مسلمانوں کی؟

آپ نے اُردو کے فروغ کا جو ذمہ اُٹھایا ہے، خدا آپ کو کامیابی عطا کرے اور یہ خوبصورت زبان پھر سے اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔

■ **سمیع سلطان پوری، بھٹی جرولی، پوسٹ کٹاواں، سلطان پور**

اپریل کا شمارہ (اردو دنیا) باصرہ نواز ہوا۔ راشد جمال فاروقی، شکیل الرحمٰن اور رشید الدین خاں کے مضامین معلومات افزا اور پُر مغز ہیں۔ اے آر فہمی صاحب نے جو جدول پیش کی ہے بلاشبہ وہ سرکاری دستاویز پر مبنی ہوتے ہوئے بھی چشم کشا ہے۔ یوں بھی مردم شماری میں اہلکاران جانب داری سے کام لیتے ہیں (کم از کم زبان کی سطح پر) وہ اردو آبادی کی زبان کو بھی اکثر و بیشتر ہندی یا دیگر زبانوں کے خانوں میں درج کر دیتے ہیں۔ اس طرح جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ حقیقت سے بعید ہوتے ہیں۔ اگر ایمان داری کے ساتھ مردم شماری کرائی جائے تو یوپی میں اردو آبادی کا تناسب 8.98 کے بجائے بیس پچیس فی صد برآمد ہوگا مگر اس کام کے لیے قارئین کہاں سے آئیں گے جبکہ ہندستانی معاشرے میں لسانی عصبیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام بھی خوب ہے، یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

■ **رضوان خاں، 96 شیخ سرائے، سیتاپور-261001**

اپریل کے شمارے میں خبرنامہ، بہار میں اردو کی صورتِ حال سے متعلق جناب م۔ ش۔ استھانوی کا مضمون اور جناب شکیل الرحمٰن صاحب کا مضمون "چین میں تصوف" خاص طور سے پسند آئے۔

■ **حمیرا سلطانہ، عربک ٹیچر، جامع مسجد، باگل کوٹ-587101**

"اردو دنیا" پہلی بار دیکھنے کو ملا۔ دیکھتے ہی مجھے افسوس ہوا کہ اتنے اعلیٰ معیار کے رسالے سے میں اب تک کیوں محروم رہی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اردو دنیا سے واقف ہوئی۔ دلکش سرورق کے ساتھ ساتھ معنوی و باطنی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ مضامین و مقالات کا معیار جدید ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ میری دعا ہے کہ "اردو دنیا" اور ترقی کرے۔

■ **چراغ بھارتی، سی این پبلک اسکول، کوٹ نمبر لی سنبھل-244302**

"اردو دنیا" برائے اپریل نظر نواز ہوا۔ مطالعے کے بعد شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اردو دنیا واقعی اردو دنیا کا حقیقی عکاس ہے۔ اس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سبھی کارکنان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"اردو دنیا" نے اپنے اداریے کے تحت اور اہلِ قلم حضرات نے اپنے تحقیقی تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کے حوالے سے اردو زبان و ادب کے واسطے سے بہت ہی اہم سوال اٹھائے ہیں جن پر عمل درآمد اردو کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔

□□□

ہماری بات

تعلیم میں معیار کا مسئلہ روز بروز سنگین صورتِ حال اختیار کرتا جارہا ہے۔ خصوصاً ابتدائی سطح کی تعلیم کے معیار کا سوال زیادہ شد ومد کے ساتھ بار بار سامنے آتا ہے کیوں کہ اسی بنیادی مرحلے کی درستگی پر آگے کی تعلیم کا دارومدار ہوتا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وقت کے تقاضے جس تیزی سے بدل رہے ہیں، مخصوص میدانوں میں طالبِ علم سے جس مہارت کی توقع کی جارہی ہے اور کیریر اور شخصیت کا کاروباری پہلو جس طرح سے مقدم گردانا جارہا ہے، تعلیم کے معیار پر بحث و تمحیص کا سلسلہ بھی اسی طرح نئے نئے پہلوؤں کے ساتھ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کون سے ذرائع اختیار کیے جائیں، یہ ایک اہم موضوع ہے لیکن اس کا کوئی سیدھا تعلق معیار کے مسئلے سے نہیں ہے۔ بنیادی بات ابتدائی سطح پر تعلیم کے معیار کی ہے جس کی کئی جہتیں ہیں اور جن پر بھرپور غور وخوض کی ضرورت ہے۔

جب ہم تعلیمی معیار کی بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے ایک پیمانہ ہوتا ہے جس کو آئیڈیل مان کر ہم کسی طالبِ عالم، کسی اسکول، ادارے یا تعلیمی نظام کا اس آئیڈیل سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس کے بہتر یا بدتر ہونے کی جانچ کرتے ہیں۔ اس طرح معیار کا تعلق سیدھے طور پر بازار کی صورتِ حال سے وابستہ ہو جاتا ہے یعنی اس بات سے کہ تعلیم پوری ہونے کے بعد ایک فرد اپنا سماجی معیار کتنا بلند کر سکے گا یا اپنے سماجی وقار اور ذاتی سرمایے میں کتنا اضافہ کر سکے گا۔ تعلیم کے اس پیمانے کو متعین کرنے والا ہمارا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ ہے اور اس پیمانے پر پورا اترنے کا معیار انگریزی زبان کی جانکاری اور پروفیشنلٹ ہونے سے متعین ہوتا ہے۔ ان دونوں ہی ضرورتوں کی تکمیل پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے تو ہوتی ہے، سرکاری اسکولوں سے نہیں۔ اس طرح تعلیم کا دوہرا نظام ہمارے سامنے ہے—وہ ماں باپ جن کی آمدنی معقول یا کافی زیادہ ہے، اپنے بچے کے بہتر مستقبل کے لیے اسے پرائیویٹ اسکول میں بھیجیں اور آئندہ کے لیے اپنی سماجی حیثیت کو مستحکم بنالیں، دوسری جانب غریب ماں باپ اپنے بچے کو مفت تعلیم فراہم کرنے والے اُس سرکاری اسکول میں بھیجیں جہاں سے فارغ ہو کر بچے کی سماجی حیثیت میں تبدیلی بالعموم بعید از امکان ہوتی ہے۔ یہ تشویش ناک صورتِ حال طبقاتی فرق کی کھائی کو مزید گہرا کر رہی ہے اور دونوں ہی طبقات میں ایک دوسرے سے کچھ سیکھنے یا ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کے امکانات کو ختم کر رہی ہے۔

اس صورتِ حال میں یہ بات غور طلب ہے کہ معیاری تعلیم کا مسئلہ متوسط اور اعلا طبقے کے بچوں کی تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ موجودہ پیمانوں کے مطابق وہ اپنے بچوں کے لیے معیاری تعلیم خریدنے کے اہل ہیں۔ مسئلہ ملک کے اسّی فی صد ان عوام کے تعلیمی معیار کا ہے جنھوں نے اپنے لیے جمہوری فلاحی نظام منتخب کیا ہے اور جس کے تحت آئین میں ان کی ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنے کی گارنٹی دی گئی ہے۔ ملک کی بیش تر آبادی کے معیاری تعلیم کے مسئلے کو سرکاری اسکولوں کی کمیاں اور خامیاں گنا کر ہلکا نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ مسئلہ یک رخی نہیں بلکہ کثیر رخی ہے۔ اس موضوع پر تعلیم میں دل چسپی رکھنے والے دانش وروں نے بہت کچھ لکھا ہے، نئے نئے زاویوں سے مباحث پیش کیے ہیں۔ ضرورت ان کی روشنی میں صوبائی اور مرکزی سرکاروں کے تعلیم کے محکموں کے ذریعے ایک مربوط اور مستحکم پالیسی اختیار کرنے کی ہے۔ خصوصاً ابتدائی تعلیم کے بنیادی حق بن جانے کے بعد ایک واضح اور مربوط حکمت عملی وقت کی انتہائی ضرورت ہے۔

اس پالیسی کے کئی پہلو ہوں گے جن میں انفراسٹرکچر کی فراہمی کے علاوہ طلبہ اور اساتذہ کی تعلیمی و علمی ضرورتوں اور ان دونوں کے درمیان کے رشتے یعنی نصاب کی معیار بندی کا کام بھی شامل ہوگا۔ ان میں سبھی کام یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا مناسب نہیں۔ جتنی ضرورت طلبہ کی ذہن سازی اور پڑھنے کا مناسب ماحول اور سہولتیں دینے کی ہے اتنی ہی ضرورت اساتذہ کی تربیت اور اس کے لیے اورینٹیشن کورسوں اور ورک شاپوں کی ہے۔ تعلیم کا مناسب ماحول تیار کرنے میں اساتذہ، طلبہ اور طلبہ کے والدین کے آپسی تعاون کے ساتھ ساتھ تعلیمی محکمے کے افسران کا تعلیمی عمل میں دل چسپی لینا بھی ضروری ہے۔ معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانے کے نصب العین کو حاصل کرنا آزادی کے پچپن سال بعد بھی جتنا مشکل نظر آرہا ہے، اس صورتِ حال میں اساتذہ، طلبہ، ان کے والدین اور افسران سے اس مستعدی اور احساسِ ذمّے داری کی توقع مناسب نہیں معلوم ہوتی جس کی آج فی الواقع ضرورت ہے۔ ایسے معاملات کو ویسے بھی انفرادی دل چسپی پر چھوڑنا مناسب نہیں ہوتا اسی لیے ایسے تعلیمی نظام کو قائم کرنے کی توقع کی جاتی ہے جس میں سبھی عنصر ایک دوسرے کے تئیں ذمّے دار رہنے کے پابند ہوں۔ نصاب کی تعیین و ترتیب کچھ بنیادوں اصولوں کو نظر پر رکھ کر سائنسی طریقے پر ہونی چاہیے اور تدریس کے اصول بھی سائنٹفک ہوں تاکہ اساتذہ یا طلبہ کی انفرادی کمزوریوں یا خامیوں کی صورت میں طلبہ کی تعلیم میں ہرج نہ ہو اور تعلیم میں کم دل چسپی رکھنے والے طلبہ بھی تعلیم کے مقصد کو ایک معینہ سطح تک حاصل کر سکیں۔ ایسے نصاب کی ترتیب اور نفاذ کے لیے جتنی جلدی اقدام کیے جائیں گے، تعلیمی منظر نامے کو موافق حالات میں ڈھالنے کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

محمد حمید اللہ بھٹ

میر بدر الدین علی

گیسٹ کالم

اقلیتی تعلیم کا منظر نامہ ــــــ ریاستِ کرناٹک میں

اقلیتی تعلیم کا منظر نامہ حقیقت میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی تعلیم اور اردو زبان کی تعلیم کے سوال سے وابستہ ہے اور یہ تعلیم انتہائی زبوں حالی اور ایسی پریشان کن صورت حال اور مسائل سے دوچار ہے کہ ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کی تعلیم سے محرومی کا اندیشہ محسوس کیا جارہا ہے۔

اس اقلیت یعنی مسلمانوں کی تعلیم اور اردو زبان کی تعلیم کے مسائل یکساں ہی ہیں۔ آبادی کے اس گروپ میں طلبہ کی کثیر تعداد میں ڈراپ آؤٹ، موزوں لیاقت سے محروم اساتذہ، جدید معلومات کی فراہمی، تعلیم و تربیت کی سہولت کا فقدان، ریاست کرناٹک کی سرکاری زبان کنڑی کے لزوم پر حد سے زیادہ اصرار اور اردو داں آبادی کی سنگین معاشی پسماندگی اور اردو زبان سے منصفانہ سلوک سے متعلق احکام اور جذبات کی پامالی وہ تشویش ناک اور سنگین مسائل ہیں جو اقلیتی تعلیم کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

یہ صورت حال کم و بیش ہر اس ریاست میں موجود ہے جہاں سرکاری زبان کوئی علاقائی زبان ہے۔ ہندی ریاستوں اور ان ریاستوں میں جہاں اردو کو چند اضلاع میں دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے، صورت حال مختلف ہو سکتی ہے۔ یہاں ریاست کرناٹک میں اقلیتی تعلیم کی صورت حال اور اس سے وابستہ چند مسائل کا ذکر کیا جارہا ہے۔

ریاستِ کرناٹک میں ساتویں جماعت تک اردو میڈیم کے کئی اردو اسکول ہیں، اور اس وقت بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے جب ان اسکولوں میں سے بیشتر ساتویں جماعت کے بورڈ امتحانات میں سو فی صد کامیابیاں ریکارڈ کرتے ہیں۔ ایک دو مرتبہ تو ان اردو اسکولوں کی کامیابی کا اوسط کنڑی اور انگریزی میڈیم اسکولوں سے بھی بہتر رہا ہے۔ لیکن اس کامیابی سے اردو داں طبقے میں مسرت اور خوشی کا جو احساس بیدار ہوتا ہے وہ چند ہی ماہ میں کافور ہو کر رہ جاتا ہے جب ساتویں کامیاب طلبہ کے آٹھویں جماعت میں داخلے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر ان طلبہ کا 97 فی صد ڈراپ آؤٹ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یعنی ساتویں جماعت پاس کرنے والے صرف تین فی صد طلبہ ہائی اسکول کا رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک رکاوٹ تو یہ ہے کہ اردو ہائی اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے اور جو بھی ہیں وہ اردو داں آبادی سے اتنے فاصلے پر ہیں کہ بچوں کی آمد و رفت کا خرچ ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ساتویں جماعت کے بعد طلبہ کو کنڑی یا انگریزی میڈیم کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور یہ جرأت صرف وہی طلبہ کر سکتے ہیں جو ان دونوں زبانوں سے کچھ نہ کچھ حد تک واقف ہوں۔ بہر حال میڈیم کے انتخاب کا مسئلہ ڈراپ آؤٹ کا دوسرا اہم سبب ہے۔ لیکن سب سے اہم سبب اردو داں اقلیت کی شدید معاشی پسماندگی اور غربت ہے۔ ہر خاندان بچوں کو اردو پرائمری اور ہائر پرائمری اسکولوں میں اس نیت سے داخل کرتا ہے کہ دس بارہ سال کی عمر تک وہ کچھ سیکھ لے اور جیسے ہی وہ اس عمر تک پہنچتا ہے اور ساتویں جماعت کامیاب کرتا ہے بچے کو فوراً محنت مزدوری کی طرف لگا دیا جاتا ہے۔ اس غربت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ایسے بچوں سے روزانہ صرف پانچ روپے کی آمدنی کا گھر والوں کو شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ گھر والوں کو بچے کی تعلیم اور کامیابی سے زیادہ مزدوری کے لائق بنانے میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کی پرائمری اور ہائر پرائمری تعلیم میں بھی کسی شوق سے زیادہ ترغیبات کا بڑا دخل ہوتا ہے جس میں فیس کی تکمیل، یونی فارم اور کتابوں کی مفت فراہمی اور بعض اسکولوں میں کھانے یا دودھ کی فراہمی بہت اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ شہر بنگلور کے ایک اردو اسکول میں داخلے کا اعلان اخبارات میں دیا گیا تھا لیکن اعلان کے بعد آخری تاریخ تک صرف پانچ بچوں نے داخلہ لیا۔ اس صورت حال نے اساتذہ کو پریشان کر دیا اور وہ اس اردو اسکول کے بند ہو جانے کا خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان اساتذہ نے طلبہ کو سہولت فراہم کرنے کے تعلق سے مقامی سماجی اداروں اور مساجد کمیٹی سے رابطہ کیا اور پھر اخبار میں اعلان دیا کہ اس اسکول میں داخلہ لینے والے طلبہ کے لیے دوپہر کے مفت کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ اس اعلان کے بعد دو دن کے اندر 165 بچوں نے داخلہ لے لیا اور یہ اسکول اب تک قائم ہے اور کام کر رہا ہے۔

اقلیتی تعلیم کو متاثر کرنے والا دوسرا اہم مسئلہ موزوں لیاقت سے محروم اساتذہ ہیں۔ عام طور پر اسکولوں میں ان اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے جنھوں نے ٹیچرس ٹریننگ کورس یا ٹی سی ایچ کیا ہو اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کورس کا نصاب بارہ تا پندرہ سال پرانا ہے اور اس کی تعلیمی سطح یا معیار اتنا پست ہے کہ ان اساتذہ کو ساتویں جماعت کے طلبہ تک کو تعلیم دینا مشکل

● یہ مضمون قومی اردو کونسل کی سہ روزہ کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ 21-19 /دسمبر 2001 کو چن مہا مشن، نئی دہلی میں پڑھا گیا۔

ہو جاتا ہے۔ آج ہر لمحہ زندگی بدلتی جارہی ہے اور ایک نیا معلوماتی اور تعلیمی انقلاب بپا ہو رہا ہے، اس کے باوجود ان اساتذہ کو جدید ترین معلومات فراہم کرنے اور انھیں تربیت دینے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ حکومتِ کرناٹک کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اساتذہ کے اورینٹیشن کے اجلاس اور معلوماتی کتابچے بعض اوقات فراہم کیے جاتے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ سارا تعلیمی کام صرف علاقائی یا سرکاری زبان کنڑا میں ہوتا ہے جس سے اردو اسکولوں کے اساتذہ محروم رہ جاتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں چند رضاکار اداروں اور مخلص افراد نے اپنے طور پر اس معلوماتی کنڑی مواد کا اردو زبان میں ترجمہ کیا اور اساتذہ کو فراہم کیا لیکن یہ کام بہت محدود سطح پر ہو سکا۔ اسی طرح حکومت کی جانب سے اردو نصابی کتب کی فراہمی میں بھی سنگین غفلت برتی جاتی ہے۔ تعلیمی سال ختم ہونے کو آجاتا ہے لیکن بیشتر اردو نصابی کتب اسکولوں کو فراہم نہیں ہوتیں۔ اردو اسکولوں کے ساتھ اس قسم کا غیر منصفانہ سلوک اصل میں ریاستی زبان پر حد سے زیادہ اصرار کا نتیجہ ہے۔ اب ایک نئی بات یہ سامنے آئی ہے کہ ریاست کرناٹک کے سارے غیر کنڑی اسکولوں میں کنڑی زبان کی تعلیم تیسری جماعت سے لازمی کر دی جائے گی۔ اسی طرح اساتذہ کے تقررات میں یہاں تک کہ اسپورٹس اور اردو زبان کے اساتذہ کے تقررات میں کنڑی کا امتحان کامیاب کرنا لازمی کر دیا گیا۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے تقررات میں کنڑی کے لزوم سے اقلیتوں خصوصاً اردو داں طبقے کے لیے گویا روزگار کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اصول یہ اختیار کیا گیا تھا کہ روزگار کا امتحان چاہے کسی زبان میں ہو کامیاب کرنے والے کو کنڑی سیکھنے کے لیے دو سال کی مدت دی جائے۔ اس اصول کو کسی حرفِ غلط کی طرح فراموش کر دیا گیا ہے۔ کنڑی پر اصرار کا یہ عالم ہے کہ اب حکومت نے میڈیکل اور انجینئرنگ جیسے پیشہ ورانہ کورسز میں داخلے کے لیے انگریزی میں ہونے والے کامن انٹرنس ٹسٹ میں، کالجوں میں کنڑی داں طلبہ کے لیے ریزرویشن کا مطالبہ کیا ہے، جب کہ یہ ٹیسٹ آل انڈیا بنیاد پر ہوتا ہے۔ کنڑی کا جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ دوسری سرکاری زبان کے جائز حقوق کی پامالی کا احساس تک نہیں ہے۔ اسی جنون کی وجہ سے بنگلور دوردرشن سے آج تک اردو نیوز شروع نہ کی جا سکی اور جب حال ہی میں ریاستی وزیر جناب قمرالاسلام نے اس سلسلے میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن سے اپیل کی تو کنڑی تنظیموں نے اس بیان کی سخت مذمت کی۔ سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ پندرہ فی صد اردو داں آبادی والے علاقے میں سرکاری اعلان اردو زبان میں جاری کرنے کے تعلق سے تمام ہدایات اور احکامات کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت نے مختلف پروگراموں کے تحت ریاستی حکومت کو مراسلے روانہ کیے تھے اور کمشنر برائے لنگوسٹک مینارٹیز نے ریاستِ کرناٹک کے بارہ اضلاع کو پندرہ فی صد سے زائد اردو آبادی کے علاقوں کے طور پر تسلیم کیا اور حکومت کو ہدایت کی تھی کہ ان علاقوں میں سرکاری مراسلے اور نوٹس اردو میں جاری کیے جائیں گے لیکن اس ہدایت کو بھی نظرانداز کر دیا گیا۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جب اس ہدایت کی پابندی کے سلسلے میں دو رضاکار اردو دانوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا اور عدالت نے حکومت کو نوٹس دے دیا تو چیف سکریٹری نے یہ سراسر غلط حلف نامہ داخل کیا کہ اردو زبان کے استعمال کے تعلق سے ہر ہدایت اور حکم کی پابندی کی جا رہی ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں متعلقہ علاقے میں کسی نے شکایت نہیں کی ہے۔ موصوف نے اس طرح اردو داں افراد کی لاعلمی اور خاموشی کو اپنے غلط بیان میں ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا اور عدالت نے عرضیاں مسترد کر دیں کہ یہ بے جا شکایت ہے۔ اس کنڑی جنون کی وجہ سے اردو زبان اور تعلیم کے خالص تعلیمی مسئلے میں فرقہ وارانہ رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اسی لیے شاید مسلمان نمائندے کسی ایوان میں سوال اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے اور اردو تعلیم مسلسل متاثر ہوتی جا رہی ہے۔

ان چند اہم اور بنیادی عوامل کی وجہ سے آج کرناٹک میں اقلیتوں کی تعلیم کا کوئی منظر ہی موجود نہیں ہے اور بات بڑھ کر اس [illegible] میں آگئی ہے کہ سوال اردو پڑھنے یا نہ پڑھنے کا نہیں، اب اقلیتوں کے تعلیم حاصل کرنے یا محروم ہی رہنے کا بن گیا ہے۔ اسی سنگین احساس کے نتیجے میں چند ادارے تعلیم کو فروغ دینے کی رضاکارانہ کوششوں میں سرگرمِ عمل ہیں جن میں الامین تحریک سرفہرست ہے۔ لیکن یہ ساری سرگرمی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں لہٰذا اس سلسلے میں حالات کے گہرے جائزے کے بعد یا فوری طور پر اقدامات بہت ضروری ہیں اور اس میں مرکزی حکومت ہی نمایاں بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہے۔ کم از کم وہ اتنا تو کرے کہ اردو زبان کی تعلیم کے تعلق سے اپنی ہدایات پر عمل کی توثیق حاصل کرے۔ چند دوسرے اہم اقدامات بھی درکار ہیں۔

ٹیچرس ٹریننگ کا نصاب فوری طور پر بدلنا چاہیے جو اتنا اپ ٹو ڈیٹ تو ہو کہ جدید معلومات اس میں شامل رہیں اور پھر مقررہ وقفے سے ان اساتذہ کی مزید تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ ایک اور اہم اقدام یہ ہو کہ چوتھی جماعت سے کمپیوٹر تربیت کا استعمال لازمی کر دیا جائے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ طلبہ کمپیوٹر کی زبان انگریزی سے واقف ہو جائیں گے جو ممکن ہے کہ ساتویں جماعت کامیاب کرنے کے بعد انھیں میڈیم کے انتخاب میں آسانی فراہم

کرے۔ ایک دوسرا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ کمپیوٹر استعمال کرنے کے شوق میں طلبہ اپنی تعلیم جاری رکھیں اور ڈراپ آؤٹ کا مسئلہ کسی حد تک ہی سہی، کم ہو جائے؛ یا اقلیتوں کی تعلیم کی سنگین نوعیت کے پیش نظر مرکزی حکومت انھیں ملک گیر مکمل خواندگی کی مہم میں شامل کرلے اور تعلیمی سہولت فراہم کرے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے بھی ایک گزارش کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو زبان کے فروغ کی اپنی کلی ہمہ ذمے داری کے تحت اس تجویز پر غور کرے کہ ایک ایسی اردو واچ ڈاگ کمیٹی قائم کی جائے جو اردو زبان اور تعلیم کے تعلق سے مرکزی حکومت اور سرکاری اداروں جیسے کمشنر فار لنگوسٹک مائنارٹیز کی ہدایات پر عمل در آمد کی صورت حال کا جائزہ لے اور وزارت فروغ انسانی وسائل کے ذریعے کسی بھی غفلت کا سخت نوٹس لے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ایسی واچ ڈاگ کمیٹی کی بہت شدید ضرورت ہے جو اپنی کارکردگی اور سفارشات سے ایک بڑی خدمت انجام دے سکتی ہے۔ فیصلوں، ہدایات اور احکامات پر عمل ہی نہ ہو تو اقلیتوں کا تعلیمی منظر کیسے روشن ہو سکتا ہے!!

Editor, Urdu Daily "Salar"
Al-Ameen Tower, No. 69, Hosur Road,
Near Lalbagh Main Gate, Bangalore-560027

Learn Urdu Through Distance Education / Self Study Programme

Certificate course in Urdu for non-Urdu knowing learners has been launched w.e.f. 1 March, 2001. The following books are available :

English Medium

- ❑ **Let's Learn Urdu**
  Beginner's Manual for Urdu Script *by Gopi Chand Narang*
- ❑ **Work Book : Let's Learn Urdu** *by Gopi Chand Narang*
- ❑ **Introductory Grammar of Urdu**
- ❑ **Work Book : Introductory Grammar of Urdu**

Hindi Medium

- ❑ उर्दू कैसे लिखें (उर्दू लिपि सीखने की बुनियादी किताब) - *गोपी चन्द नारंग*
- ❑ अभ्यास पुस्तिका : उर्दू कैसे लिखें - *गोपी चन्द नारंग*
- ❑ प्रारंभिक उर्दू व्याकरण
- ❑ अभ्यास पुस्तिका : प्रारंभिक उर्दू व्याकरण

Books will be supplied free of cost to registered learners. For prospectus & application form write to :

Urdu Education Cell

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-8, Wing-7, R.K.Puram, New Delhi-110066
email : urdueducation@hclinfinet.com

اے. آر. فتیحی

بہار اور جھارکھنڈ میں اردو آبادی

رقبہ (بہار) 94163 مربع کلومیٹر،
بہار کی کل آباد 8 کروڑ 28 لاکھ (2001)
راجدھانی پٹنہ
اہم زبانیں ہندی، اردو، میتھلی، بھوج پوری، مگہی

رقبہ (جھارکھنڈ) 79714 مربع کل میٹر
کل آبادی 2 کروڑ 69 لاکھ (2001)
راجدھانی رانچی
اہم زبانیں ہندی، اردو اور قبائلی زبانیں

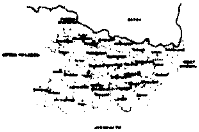
بہار

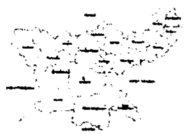
جھارکھنڈ

بہار کا ذکر ویدوں، پرانوں، اور قدیم کہانیوں میں ملتا ہے۔ بہار مہاتما بدھ کی ''کرم بھومی'' رہی ہے۔ قبل مسیح سے ہی اس علاقے پر بمبسار، ادین، چندرگپت موریہ، سمراٹ اشوک جیسے حکمرانوں کے علاوہ شنگ اور کنوراجاؤں نے حکومت کی۔ اس کے بعد کشان اور پھر گپت سلطنت کی حکومت رہی۔ عہدِ وسطیٰ میں اس علاقے پر مسلمان حکمرانوں کا قبضہ رہا۔ بہار کو سب سے پہلے فتح کرنے والا مسلم حکمراں محمد بن بختیار خلجی تھا۔ خلجی سلطنت کے بعد تغلق سلطنت اور مغلیہ سلطنت کا قبضہ رہا۔ مغلیہ سلطنت کے بکھرنے پر انگریزوں نے 1757ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد بہار میں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔ 1911ء تک بہار بنگال پریسی ڈنسی کا حصہ رہا۔ 12 دسمبر 1911ء کو بہار اور اڑیسہ کو الگ صوبہ بنا دیا گیا۔ 1936ء میں بہار علاحدہ صوبہ ہو گیا۔ بیسویں صدی میں قبائلی تشخص کا احساس بڑھتا گیا اور جھارکھنڈ صوبے کی مانگ بڑھتی گئی نتیجتاً بہار کو تقسیم کا درد ایک بار پھر سہنا پڑا۔

مندرجۂ ذیل ٹیبل میں اس صوبے کے مختلف اضلاع کی کل آبادی، اردو آبادی، صدر دفاتر اور رقبے کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

ٹیبل۔1: بہار میں ضلعوں کی آبادی، اردو آبادی، رقبہ اور صدر دفاتر

نمبر	ضلع	رقبہ مربع کلو میٹر	کل آبادی (لاکھ)	صدر دفتر	کل اردو آبادی (لاکھ)	فی صد (کل آبادی و اردو آبادی)	کل مسلم آبادی (لاکھ)	فی صد (کل آبادی و مسلم آبادی)	فی صد (اردو آبادی و مسلم آبادی)
1	ارریا	2796.8	16.12	ارریا	5.29	32.8	6.52	40.4	81.1
2	اورنگ آباد	3389.2	15.40	اورنگ آباد	1.03	6.7	1.46	9.5	70.7
3	بیگوسرائے	1889.1	18.15	بیگوسرائے	1.86	10.3	2.23	12.3	83.4
4	بھاگلپور	2501.9	32.02	بھاگلپور	3.36	10.5	4.44	13.9	75.7
5	بھوجپور	2337.0	28.80	آرہ	0.68	2.4	1.88	6.5	36.4
6	دربھنگہ	2502.0	25.11	دربھنگہ	5.05	20.1	5.55	22.1	91.0
7	گیا	4941.0	26.65	گیا	2.37	8.9	3.05	11.5	77.6
8	گوپال گنج	2009.2	17.04	گوپال گنج	0.75	4.4	2.82	16.6	26.7
9	جہان آباد	1569.3	11.75	جہان آباد	0.77	6.5	0.95	8.1	81.0
10	کٹیہار	3009.9	18.25	کٹیہار	4.82	26.4	7.28	39.9	66.2

11	کھگریا	1485.8	9.87	کھگریا	0.79	8.0	0.96	9.7	82.8
12	کشن گنج	1938.5	9.84	کشن گنج	5.28	53.6	6.49	65.9	81.3
13	مدھے پورہ	1797.4	11.78	مدھے پورہ	0.90	7.7	1.22	10.3	74.4
14	مدھوبنی	3477.8	28.32	مدھوبنی	3.71	13.1	4.73	16.7	78.4
15	مونگیر	3302.2	30.60	مونگیر	2.04	6.7	2.49	8.1	81.8
16	مظفر پور	3122.7	29.54	مظفر پور	3.21	10.9	4.37	14.8	73.4
17	نالندہ	2361.7	19.98	بہار شریف	1.35	6.7	1.70	8.5	79.2
18	نوادہ	2497.5	13.59	نوادہ	1.10	8.1	1.55	11.4	71.3
19	مغ چمپارن	4249.9	23.34	بیتیا	1.87	8.0	4.80	20.6	39.0
20	پٹنہ	3130.1	36.18	پٹنہ	2.11	5.8	2.71	7.5	78.0
21	مشرقی چمپارن	4154.8	30.43	موتیہاری	3.02	9.9	5.60	18.4	53.8
22	پورنیہ	3202.3	18.79	پورنیہ	5.36	28.5	6.49	34.5	82.6
23	روہتاس	3838.2	29.01	ساسارام	1.16	4.0	2.71	9.3	42.8
24	سہرسہ		24.75	سہرسہ	2.86	11.6	3.59	14.5	79.8
25	سمستی پور	2578.7	27.17	سمستی پور	2.30	8.5	2.73	10.1	84.0
26	سارن	2624.1	25.73	سارن	0.76	3.0	2.52	9.8	30.1
27	سیتامڑھی	2627.7	23.91	سیتامڑھی	3.79	15.9	4.72	19.7	80.4
28	سیوان	2213.0	21.71	سیوان	1.63	7.5	3.74	17.2	43.6
29	ویشالی	1995.3	21.46	حاجی پور	1.44	6.7	2.03	9.4	70.9
		کل	645.3		70.6	10.9	101.3	15.7	69.7

اس کے علاوہ بہار میں شیوہر، سوپول، بانکا، لکھی سرائے، شیخپورہ، بکسر، کیمور (بھبوا) اور جموئی اضلاع شامل کیے گئے ہیں ۔ اور اس طرح بہار میں کل اضلاع کی تعداد 38 ہو جاتی ہے ۔

ٹیبل ۔2: جھارکھنڈ میں ضلعوں کی آبادی، اردو آبادی، رقبہ اور صدر دفاتر

نمبر	ضلع	رقبہ مربع کلو میٹر	کل آبادی (لاکھ)	صدر دفتر	کل اردو آبادی (لاکھ)	فی صد (کل آبادی و اردو آبادی)	کل مسلم آبادی (لاکھ)	فی صد (کل آبادی و مسلم آبادی)	فی صد (اردو آبادی و مسلم آبادی)
1	دیوگھر	2478.6	9.33	دیوگھر	1.01	10.9	1.67	17.9	60.6
2	دھنباد	2074.8	26.75	دھنباد	2.15	8.1	3.29	12.3	65.6
3	دمکا	5518.2	14.96	دمکا	0.67	4.5	1.51	10.1	44.3
4	گریڈیہہ	4887.0	22.25	گریڈیہہ	1.51	6.8	3.59	16.1	42.2
5	گوڈا	2110.4	8.61	گوڈا	1.09	12.7	1.53	17.7	71.7
6	گملہ	1932.8	11.54	گملہ	0.20	1.7	0.35	3.0	57.7
7	ہزاری باغ	7277.1	28.44	ہزاری باغ	2.12	7.4	3.74	13.2	56.5
8	لوہارڈاگا	2835.4	2.89	لوہارڈاگا	0.31	10.8	0.41	14.3	75.1
9	پلامو	7975.8	24.51	ڈالٹن گنج	1.46	6.0	2.82	11.5	51.8

10	مغ سنگھبھوم	8012.0	17.88	چائباسا	0.32	1.8	0.43	2.4	74.8
11	مشرقی سنگھبھوم	3533.3	16.13	جمشید پور	1.17	7.3	1.31	8.1	89.7
12	رانچی	7973.8	22.14	رانچی	1.65	7.5	2.29	10.4	72.1
13	صاحب گنج	3405.6	13.01	صاحب گنج	1.08	8.3	3.67	28.2	29.5
		کل	218.4		14.7	6.7	26.6	12.2	55.4

اس کے علاوہ گرھوا، چترا، کوڈرما، پاکور اور بوکارو اضلاع شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح جھارکھنڈ میں کل اضلاع کی تعداد 18 ہو جاتی ہے۔

ٹیبل 1 اور 2 کے اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کے ان اضلاع کی آبادی میں نمایاں فرق ہے۔ یہ فرق چند سو سے لے کر ہزاروں تک پہنچ جاتا ہے۔ بہار میں آبادی کے لحاظ سے پٹنہ سب سے گھنی آبادی والا اور کشن گنج سب سے کم آبادی والا ضلع ہے۔ جھارکھنڈ میں ہزاری باغ سب سے گھنی آبادی والا اور لوہارڈگا سب سے کم آبادی والا ضلع ہے۔ رقبے کے اعتبار سے بھی بہار اور جھارکھنڈ کے تمام اضلاع میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بہار میں کھگریا اور جھارکنڈ میں گملہ رقبے کے اعتبار سے سب سے چھوٹا ضلع ہے اور اسی طرح مغربی چمپارن و پلاموسب سے بڑا۔ اس ٹیبل سے بہار اور جھارکھنڈ کے مختلف اضلاع میں اردو آبادی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اردو آبادی کے اعتبار سے بہار میں پورنیہ ضلع اور جھارکھنڈ میں دھنباد ضلع کو اولیت حاصل ہے۔ پورنیہ میں 5 لاکھ اور دھنباد میں 2 لاکھ سے زیادہ کی آبادی اردو بولتی ہے۔ یہ آبادی پورنیہ کی کل آبادی کا 28.5 فی صد اور دھنباد کی کل آبادی کا 8.1 فی صد ہے۔ بہار میں اردو بولنے والی کل آبادی 71.7 لاکھ اور جھارکھنڈ میں 13.7 لاکھ ہے۔ جس میں 61.2 لاکھ (85%) اردو داں طبقہ دیہی علاقے میں اور 10.8 لاکھ (15%) شہری علاقے میں رہتا ہے۔ اسی طرح جھارکنڈ میں 8.3 لاکھ (61%) اردو داں طبقہ دیہی علاقے میں اور 5.2 لاکھ (39%) شہری علاقے میں رہتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار اور جھارکھنڈ میں اردو ایک دیہی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بات کو بخوبی سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل گراف کی مدد لی جا سکتی ہیں۔

گراف-1: اردو داں طبقے میں دیہی اور شہری آبادی کا تناسب

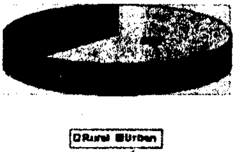

جھارکھنڈ

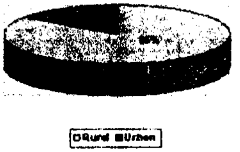

بہار

اس گراف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کے اس صوبے کے اردو آبادی کا ایک بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے بہار اور جھارکھنڈ میں اردو زبان کا لسانی مزاج دیہی ہے۔ بہار میں 71.7 لاکھ کی کل اردو آبادی میں 37.4 لاکھ مرد ہیں اور 34.7 لاکھ عورتیں ہیں۔ اسی طرح جھارکھنڈ میں 13.7 لاکھ کی کل اردو آبادی میں 6.9 لاکھ مرد ہیں اور 6.4 لاکھ عورتیں ہیں۔ اردو کی کل آبادی میں یہ فرق کسی نمایاں تانیثی فرق (Gender Difference) کی عکاسی نہیں کرتا۔

بہار اور جھارکھنڈ میں اردو آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ان دس اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں اردو آبادی کا تناسب 10 فیصد سے زیادہ ہے۔ حکومت بہار نے 16 اگست 1989 میں بہار کے تمام اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس طرح ریاست بہار و جھارکھنڈ کے 42 اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل ٹیبل میں اردو آبادی والے دس اہم اضلاع کی کل آبادی، اردو آبادی اور ان کا تناسب پیش کیا گیا ہے۔

ٹیبل ۔3: 10 فیصد کے قریب اردو آبادی والے اضلاع

نمبر	ضلع	کل آبادی (لاکھ)	کل اردو آبادی (لاکھ)	فی صد
1	ارریا	16.1	5.3	32.80
2	دربھنگہ	25.1	5.1	20.12
3	دیوگھر	9.3	1.0	10.9
4	گوڈا	8.6	1.1	12.70
5	کٹیہار	18.3	4.8	26.39
6	کشن گنج	9.8	5.3	53.61
7	مدھوبنی	28.3	3.7	13.10
8	پورنیہ	18.8	5.4	28.52
9	سہرسا	24.8	2.9	11.56
10	سیتامڑھی	23.9	3.8	15.86

اس ٹیبل کے اعداد و شمار سے مندرجۂ ذیل چند اہم نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں :

- سبھی دس اضلاع میں اردو آبادی کا تناسب 10 فیصد سے زیادہ ہے۔
- دیوگھر میں اردو آبادی 1 لاکھ سے زیادہ ہے اور اس کا تناسب تقریباً 10.9 فیصد ہے۔
- کشن گنج میں اردو آبادی سب سے زیادہ ہے اور یہ تناسب 53.6 فیصد ہے۔

مندرجۂ ذیل گراف کی مدد سے ان اضلاع میں کل آبادی اور اردو آبادی کے تناسب کو پیش کیا گیا ہے۔ اس گراف سے کل آبادی اور اردو آبادی کے فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

گراف-2: کل آبادی اور اردو آبادی کا تناسب

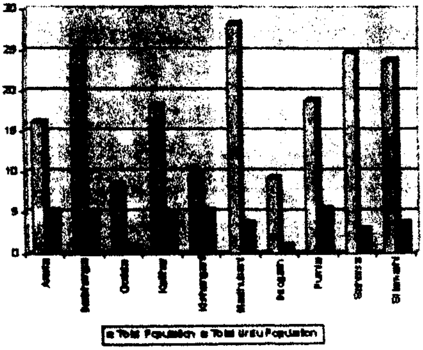

اس گراف سے یہ ظاہر ہے کہ مدھوبنی ضلع میں کل آبادی اور اردو آبادی کے درمیان فرق سب سے زیادہ ہے اور ضلع کشن گنج میں یہ فرق سب سے کم ہے۔

اردو مسلم تشخص کی علامت ؟

اردو کو ہمیشہ مسلم تشخص کی علامت سمجھا گیا ہے۔ زیر نظر مطالعے میں اعداد و شمار کے حوالے سے اس بنیادی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے مندرجۂ ذیل ٹیبل میں اردو آبادی اور مسلم آبادی کے تناسب کو پیش کیا گیا ہے:

ٹیبل-4: بہار میں اردو آبادی اور مسلم آبادی کا تناسب

نمبر	ضلع	کل اردو آبادی (لاکھ)	کل مسلم آبادی (لاکھ)	فی صد (اردو آبادی و مسلم آبادی)
1	ارریا	5.29	6.52	81.1
2	اورنگ آباد	1.03	1.46	70.7
3	بیگوسرائے	1.86	2.23	83.4
4	بھاگلپور	3.36	4.44	75.7
5	بھوجپور	0.68	1.88	36.4
6	دربھنگہ	5.05	5.55	91.0
7	گیا	2.37	3.05	77.6
8	گوپال گنج	0.75	2.82	26.7
9	جہاں آباد	0.77	0.95	81.0
10	کٹیہار	4.82	7.28	66.2
11	کھگڑیا	0.79	0.96	82.8
12	کشن گنج	5.28	6.49	81.3
13	مدھے پورہ	0.90	1.22	74.4
14	مدھوبنی	3.71	4.73	78.4
15	مونگیر	2.04	2.49	81.8
16	مظفر پور	3.21	4.37	73.4
17	نالندہ	1.35	1.70	79.2
18	نوادہ	1.10	1.55	71.3
19	مغ چمپارن	1.87	4.80	39.0
20	پٹنہ	2.11	2.71	78.0
21	مش چمپارن	3.02	5.60	53.8
22	پورنیہ	5.36	6.49	82.6
23	روہتاس	1.16	2.71	42.8
24	سہرسہ	2.86	3.59	79.8
25	سمستی پور	2.30	2.73	84.0
26	سارن	0.76	2.52	30.1
27	سیتامڑھی	3.79	4.72	80.4
28	سیوان	1.63	3.74	43.6
29	ویشالی	1.44	2.03	70.9

ٹیبل-5: جھارکھنڈ میں اردو آبادی اور مسلم آبادی کا تناسب

نمبر	ضلع	کل اردو آبادی (لاکھ)	کل مسلم آبادی (لاکھ)	فی صد (اردو آبادی و مسلم آبادی)
1	دیوگھر	1.01	1.67	60.6
2	دھنباد	2.15	3.29	65.6
3	دمکا	0.67	1.51	44.3
4	گریڈیہہ	1.51	3.59	42.2
5	گوڈا	1.09	1.53	71.7
6	گملہ	0.20	0.35	57.7
7	ہزاری باغ	2.12	3.74	56.5
8	لوہارڈاگا	0.31	0.41	75.1
9	پلامو	1.46	2.82	51.8
10	مغ سنگھبوم	0.32	0.43	74.8
11	مش سنگھبوم	1.17	1.31	89.7
12	رانچی	1.65	2.29	72.1
13	صاحب گنج	1.08	3.67	29.5

ٹیبل 4 اور 5 کے تجزیاتی مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو آبادی اور مسلم آبادی کا تناسب تقریباً 66 فیصد کا ہے یعنی ان صوبوں میں 66 فیصد مسلم آبادی اردو کو مادری زبان تسلیم کرتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو اور مسلم آبادی کے درمیان ایک

مضبوط رشتہ ہے۔ اس مضبوط باہمی رشتے کے باوجود بہار اور جھارکھنڈ کے مسلم آبادی کا تقریباً 34 فیصد حصہ اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم نہیں کرتا۔

اردو آبادی میں دہ سالہ اضافے کی شرح

اردو کی ترقی وترویج کا بخوبی اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو آبادی کی دہ سالہ اضافے کی شرح کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے۔ اس مطالعے سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار سے اردو کی ترقی وترویج کی رفتار اور اردو داں طبقے میں اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر 1971، 1981 اور 1991 کی مردم شماری کے اعداد وشمار کی مدد سے بہار اور جھارکھنڈ میں اردو کی ترقی و ترویج کی رفتار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیچے دیے گئے ٹیبل میں 1971، 1981 اور 1991 میں اردو آبادی اور مسلم آبادی کے اضافے کی شرح کو واضح کیا گیا ہے:

ٹیبل-6: اردو اور مسلم آبادی میں اضافے کی شرح

نمبر		1971	فی صد	1981	فی صد	1991
1.	مسلم	7594173	23.10	9874993	22.78	12,787,985
2.	اردو	4993284	28.21	6955838	18.57	8541770

گراف-3: اضافے کی شرح

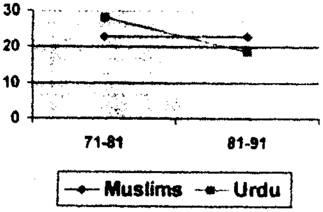

اس ٹیبل کے اعداد وشمار اور گراف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس صوبے میں مسلم آبادی میں اضافے کی شرح اردو آبادی میں اضافے کی شرح سے کہیں بہتر ہے۔ 1971 سے 1981 کے درمیان اردو آبادی میں اضافے کی شرح 28.21 فی صد تھی جو 1981 سے 1991 کے درمیان گھٹ کر 18.57 فی صد رہ گئی۔ اضافے کی شرح میں تقریباً 10 فی صد کی گراوٹ تشویشناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بدلتی صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا جائے تاکہ اس کے بہتری کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ مسلم آبادی میں اضافے کی شرح میں بھی معمولی گراوٹ نظر آتی ہے۔

اردو آبادی میں لسانی تکثیریت

آج ہندستان میں لسانی تکثیریت کی شرح میں نمایاں اضافہ ہو رہا ہے۔ لسانی تکثیریت کی شرح میں اضافہ لسانی جمہوریت کا شاخسانہ ہے۔ اقلیتی لسانی جماعتوں میں عدم تحفظ کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ نتیجتاً لسانی اقلیتیں ہر قسم کے لسانی اختلافات کو بھول کر لسانی تکثیریت کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بہار اور جھارکھنڈ میں بھی لسانی ارتباط کی فضا ہموار نظر آتی ہے۔ اس صوبے کی اردو آبادی میں لسانی تکثیریت کے رجحان کا بخوبی اندازہ کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل ٹیبل میں یک لسانی اور ذولسانی آبادی کے اعداد وشمار پیش کیے گئے ہیں:

ٹیبل-7: اردو آبادی میں لسانی تکثیریت

			کل آبادی (لاکھ)	فی صد	مرد (لاکھ)	فی صد	عورت (لاکھ)	فی صد	دیہی (لاکھ)	فی صد	شہری (لاکھ)	فی صد
کل اردو بولنے والے			85.4	(9.8) 19.6	44.3	51.8	41.1	48.1	69.5	81.3	16.0	18.6
یک لسانی			59.2	69.2	28.3	47.8	30.9	52.1				
ذولسانی			26.2	30.7	15.9	60.7	10.3	39.2				
نمبر	زبان	بولنے والے	فی صد	مرد (لاکھ)	فی صد	عورت (لاکھ)	فی صد					
1	بنگالی	0.9	1	0.4	51.8	0.4	48.1					
2	انگلش	1.3	1.5	0.9	68.2	0.4	31.7					
3	ہندی	16.4	19.1	10.2	62.2	6.2	37.7					

ان اعداد و شمار کی تجزیے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس صوبے کی اردو آبادی میں ذولسانیت 30.7 فی صد ہے۔ یعنی اردو آبادی کا 30.7 فی صد طبقہ ایک سے زائد زبانوں سے واقف ہے۔ بہار اور جھارکھنڈ کی 19 فی صد سے زائد اردو آبادی ہندی زبان سے واقف ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو آبادی اکثریتی جماعتوں کے ساتھ باہمی لسانی اختلاط وارتباط میں یقین رکھتی ہے۔

اردو آبادی والے اضلاع میں شرح خواندگی

اردو کی ترقی و ترویج کا مسئلہ شرح خواندگی سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ہندستان کی ریاست بہار اور جھارکھنڈ میں شرح خواندگی 30.5 فیصد ہے جو ہندستان کی عام شرحِ خواندگی 42.8 فیصد سے بہت کم ہے۔ 2001 کے اعداد و شمار کے مطابق ہندستان کی شرح خواندگی 65.38 فی صد ہے جبکہ بہار میں شرح خواندگی صرف 47.53 فی صد ہے۔ جھارکھنڈ میں صورت حال کچھ بہتر ہے اور اس صوبے کی شرح خواندگی 54.13 فی صد ہے۔

بہرکیف اگر بہار اور جھارکھنڈ کی اردو آبادی والے 10 اضلاع کی شرح خواندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اوپر کی شرح خواندگی دربھنگہ کی ہے۔ 1991 کے اعداد و شمار کے مطابق اس کی شرح 27.7 فیصد ہے اور سب سے کم شرح خواندگی ضلع کشن گنج میں ہے جس کی کل شرح 17.5 فیصد ہے۔ ان اضلاع کی شرح خواندگی اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ ریاست بہار کی اوسط شرح خواندگی 30.5 فی صد جبکہ اردو آبادی والے اضلاع میں یہ شرح خواندگی گھٹ کر 17.5 فی صد سے 27.7 فی صد کے درمیان رہ جاتی ہے۔ کشن گنج میں اردو آبادی کا تناسب 53.61 فی صد ہے اور یہ شرح خواندگی میں ریاست کا سب سے پچھڑا ہوا ضلع ہے۔ پروفیسر جابر حسین نے اپنے ایک تجزیاتی مطالعے ''آنکڑے سچ بولتے ہیں'' میں بہار کے اردو آبادی والے اضلاع میں شرح خواندگی میں کمی کی بخوبی نشاندہی کی ہے۔

اس تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو آبادی والے اضلاع میں بالعموم شرح خواندگی ریاست کی شرح خواندگی سے بھی کم ہے۔ یہ صورت حال تشویشناک ہے اور اس صورت حال سے بخوبی نپٹنے کے لیے ایک کارگر لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اردو آبادی میں شرح خواندگی کی تفصیل مندرجۂ ذیل ٹیبل میں پیش کی گئی ہے۔

ٹیبل-8: اردو آبادی میں شرح خواندگی

نمبر	ضلع	کل آبادی (لاکھ)	کل تعلیم یافتہ (لاکھ)	مرد (لاکھ)	عورت (لاکھ)	دیہی (لاکھ)	شہری (لاکھ)
1	اررِیا	16.1	3.3 (20.4%)	2.5 (74.8%)	0.8 (25.1%)	2.8 (85.7%)	0.5 (14.2%)

2	دربھنگہ	25.1	7.0 (27.7%)	5.1 (72.7%)	1.9 (27.2%)	5.8 (82.7%)	1.2 (17.2%)
3	گوڈا	8.6	2.3 (27.2%)	1.8 (74.8%)	0.6 (25.1%)	2.2 (94.0)	0.1 (5.9%)
4	کٹیہار	18.3	4.1 (22.3%)	3.0 (72.2%)	1.1 (27.7%)	3.1 (77.0%)	0.9 (22.9%)
5	کشن گنج	9.8	1.7 (17.5%)	1.3 (77.6%)	0.4 (22.3%)	1.3 (76.9%)	0.4 (23.0%)
6	مدھوبنی	28.3	7.5 (26.6%)	5.7 (75.7%)	1.8 (24.2%)	7.1 (93.6%)	0.5 (6.3%)
7	مشرقی چمپارن	30.4	6.6 (21.8%)	5.1 (76.9%)	1.5 (23.0%)	5.8 (87.4%)	0.8 (12.5%)
8	پورنیہ	18.8	4.2 (22.3%)	3.0 (72.3%)	1.2 (27.6%)	3.4 (80.2%)	0.8 (19.7%)
9	سہرسا	24.8	5.7 (22.9%)	4.3 (76.1%)	1.4 (23.8%)	4.9 (86.2%)	0.8 (13.7%)
10	سیتامڑھی	23.9	5.4 (22.4%)	4.0 (74.6%)	1.4 (25.3%)	4.8 (88.5%)	0.6 (11.4%)

مندرجہ ذیل گراف میں شرح خواندگی کا تصویری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

گراف-4: اردو آبادی میں شرح خواندگی

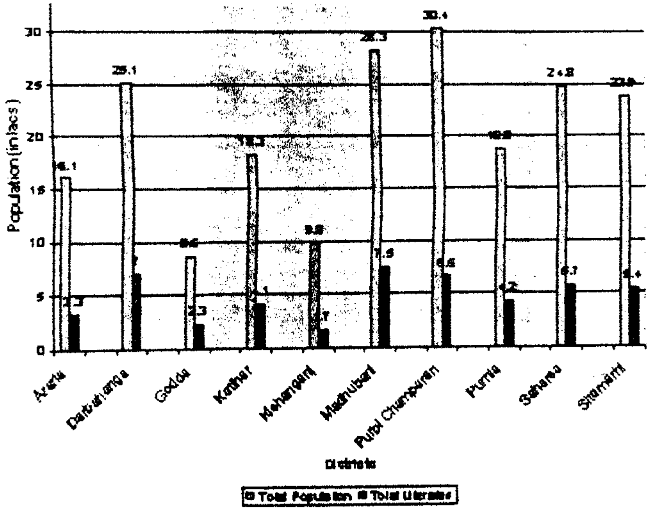

اردو آبادی والے اضلاع میں تعلیم

اردو کی ترقی و فروغ کا معاملہ خصوصی طور پر تعلیم سے وابستہ ہے۔ اردو آبادی کی نئی نسل ناخواندگی کے سبب اردو زبان کی تحریری شکل سے ناواقف ہوتی جارہی ہے۔ اردو خواندگی کے فروغ کے لیے اردو تعلیم کی ترقی و ترویج لازمی شرط ہے۔ اردو کی ترقی اسکولی سطح کی اردو تعلیم اور کم از کم پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول (مڈل) سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ ہے۔ صوبے کے اردو آبادی والے اضلاع میں تعلیم کا تجزیاتی جائزہ اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ مندرجۂ ذیل ٹیبل بہار اور جھارکھنڈ کی اردو آبادی والے اضلاع کی تعلیمی صورت حال کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

ٹیبل-9: اردو آبادی والے اضلاع میں تعلیم

نمبر	ضلع	کل تعلیم یافتہ (لاکھ)	غیر رسمی تعلیم (لاکھ)	ابتدائی تعلیم (لاکھ)	مڈل (لاکھ)	میٹرک (لاکھ)	10+2 (لاکھ)	بغیر ٹیکنیکل ڈپلوما (لاکھ)	ٹیکنیکل ڈپلوما (لاکھ)	گریجویٹ اور اس کے اوپر (لاکھ)
	بہار	264.0	7.6 (2.8%)	111.6 (42.3%)	70.0 (26.5%)	43.1 (16.3%)	14.6 (5.5%)	0.2 (0.09%)	0.26 (0.1%)	16.5 (6.2%)
1	ارریا	3.3	0.1 (4.2%)	1.4 (43.2%)	0.9 (27.5%)	0.5 (14.8%)	0.2 (4.8%)	0.005 (0.1%)	0.003 (0.08%)	0.2 (5.0%)
2	دربھنگہ	7.0	0.1 (1.5%)	3.1 (44.7%)	1.8 (25.3%)	1.1 (15.5%)	0.4 (5.5%)	0.008 (0.1%)	0.007 (0.09%)	0.5 (7.1%)
3	گوڈا	2.3	0.07 (3.0%)	1.1 (47.2%)	0.6 (25.8%)	0.4 (15.3%)	0.1 (4.1%)	0.004 (0.1%)	0.002 (0.06%)	0.1 (4.2%)
4	کٹیہار	4.1	0.1 (2.5%)	1.9 (46.2%)	1.1 (26.7%)	0.6 (14.2%)	0.2 (4.6%)	0.005 (0.1%)	0.004 (0.09%)	0.2 (5.5%)
5	کشن گنج	1.7	0.08 (4.4%)	0.9 (50.0%)	0.4 (25.4%)	0.2 (11.2%)	0.07 (4.0%)	0.001 (0.05%)	0.0007 (0.04%)	0.1 (4.7%)
6	مدھوبنی	7.5	0.3 (4.0%)	3.2 (42.1%)	1.9 (25.6%)	1.2 (15.6%)	0.4 (5.6%)	0.010 (0.1%)	0.008 (0.1%)	0.5 (6.7%)
7	مشرقی چمپارن	6.6	0.2 (3.3%)	3.0 (45.0%)	1.8 (26.6%)	1.0 (15.1%)	0.3 (4.8%)	0.005 (0.07%)	0.004 (0.07%)	0.3 (4.8%)
8	پورنیہ	4.2	0.09 (2.0%)	1.8 (43.7%)	1.1 (27.1%)	0.6 (15.3%)	0.2 (5.3%)	0.008 (0.1%)	0.004 (0.09%)	0.3 (6.1%)
9	سہرسا	5.7	0.3 (5.3%)	2.0 (35.1%)	1.6 (28.8%)	1.0 (17.8%)	0.3 (5.5%)	0.007 (0.1%)	0.005 (0.08%)	0.4 (7.0%)
10	سیتامڑھی	5.4	0.17 (3.1%)	2.4 (45.6%)	1.4 (26.4%)	0.8 (14.9%)	0.3 (4.7%)	0.007 (0.1%)	0.002 (0.04%)	0.3 (4.8%)

اس ٹیبل سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ان اضلاع کی 45 فی صد خواندہ آبادی پرائمری تعلیم سے آگے کی تعلیم نہیں حاصل کر پاتی۔ بالفاظ دیگر پرائمری سطح پر ''ڈراپ آؤٹ'' کا فی صد 45 ہے جو آندھرا پردیش سے کچھ بہتر ہے۔ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول تک کے تعلیمی سلسلے کی ٹوٹی ہوئی کڑی کو جوڑنے کے لیے موثر اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس چارٹ سے پرائمری

سطح پر سلسلہ تعلیم کے ختم ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو تعلیم کی بگڑتی ہوئی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے موثر قدم اٹھائے جائیں۔ مندرجۂ بالا ٹیبل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو آبادی کے لیے باقاعدہ اور منظم پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ پالیسی اتنی حساس ہونی چاہیے کہ ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھ سکے جو اردو تعلیم سے بیگانگی کے ذمہ دار ہیں۔ اس پالیسی کے تحت ان وجوہات پر غور کرنا ہوگا جن کی بدولت اردو کی ترقی سے متعلق سرکاری پالیسیاں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ اردو تعلیم کو کارگر بنانے کے لیے ایسے اقدام اٹھانے ہوں گے جن کے تحت اردو تعلیم کو بازار کی ضرورتوں سے جوڑا جا سکے اور تکنیکی و انتظامی سطح پر اس کی افادیت نمایاں کی جا سکے۔ جدید کاری کی یہ کوششیں اردو تعلیم کو مذہبی اور دینی تعلیم کے محدود دائرے سے باہر نکالنے میں کارگر ثابت ہوں گی۔ اس صورت حال کی تصویری نمائندگی کے لیے مندرجہ ذیل چارٹ کی مدد لی گئی ہے۔

گراف-5: اردو آبادی میں تعلیم

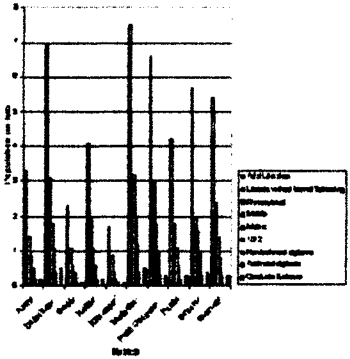

اردو ذریعۂ تعلیم

دستور ہند کی مختلف دفعات اور شقوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندستان کے شہریوں کو اپنی لسانی اور تہذیبی میراث کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ دفعہ 350-A کے مطابق "ہر ریاست اور ریاست کے ہر بااختیار ادارے کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ لسانی اقلیت سے تعلق رکھنے والے بچوں کو ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے لیے معقول سہولیات مہیا کرے اور اگر صدر اس طرح کی سہولیات فراہم کرنے کو لازمی یا مناسب سمجھے تو وہ اس سلسلے میں کسی بھی ریاست کے نام ہدایت جاری کر سکتا ہے۔"

دستور کی دفعہ 350-A کے رو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاستی یا مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ عوام کی مرضی کے خلاف ذریعۂ تعلیم کے طور پر کوئی بھی زبان استعمال کرے۔ اس پس منظر میں جب ہم صوبہ بہار اور جھارکھنڈ کے ذریعۂ تعلیم میں مستعمل زبانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو مندرجۂ ذیل تفصیلات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان تفصیلات کو ٹیبل کی شکل میں نیچے پیش کیا گیا ہے۔

	پرائمری	اپر پرائمری	سیکنڈری	ہائر
NCERT Third Survey	5+1	4+1	N.A.	3
NCERT Fifth Survey	6+1	6+1	6	3

مندرجۂ بالا اعداد و شمار سے محسوس ہوتا ہے کہ حکومت بہار اور جھارکھنڈ نے صوبے کی کثیر لسانی صورت حال کو بخوبی سمجھا ہے اور اس پیش نظر کئی زبانوں کو بطور ذریعۂ تعلیم استعمال کیا ہے۔ NCERT کے تیسرے سروے کے مطابق پرائمری سطح پر پانچ زبانیں ذریعۂ تعلیم کے طور پر فراہم تھیں۔ سکنڈری اور ہائر سکنڈری کی سطح پر 4 اور 3 زبانوں میں تعلیم دستیاب تھی۔ لیکن بعد میں پرائمری تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پرائمری سطح پر زبانوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور NCERT کے پانچویں سروے کے مطابق بہار اور جھارکھنڈ میں پرائمری سطح پر 6 زبانوں اور ایک قبائلی زبان میں تعلیم دستیاب ہے۔ سکنڈری اور ہائر سکنڈری سطح پر قبائلی زبان میں تعلیم کی سہولت ختم کر دی جاتی ہے۔ اس صوبے میں پرائمری سے لے کر ہائر سیکنڈری تک اردو بطور ذریعۂ تعلیم مستعمل ہے۔

Principal Publication Officer
NCPUL, New Delhi

محمد شاہد حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین اور اردو تعلیم

ذاکر حسین کے حوالے سے "اردو تعلیم کے ایجنڈے کا تعین" خاصا دلچسپ اور بحث طلب موضوع ہے۔ اس موضوع میں ایک مخصوص زاویہ یہ بھی مضمر ہے کہ ہندی مسلمان تبدیل شدہ حالات میں اردو کے ساتھ اپنے رشتوں پر ازسر نو غور کرنا چاہتا ہے اور تخصیص کے ساتھ یہ موضوع شمالی ہند خصوصاً اتر پردیش اور بہار میں اردو کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ یہ مقالہ بھی اسی زاویے تک محدود اور اسی کی جزئیات کو محیط ہے۔

اتر پردیش جو اردو کا اہم ترین صوبہ ہے اور جسے داگذار کرانے کے لیے 1952ء میں ذاکر حسین نے عوامی جدوجہد کا آغاز کیا تھا، آج بھی اردو کے حقوق کے لیے عوامی تحریک کا مطالبہ کرتا ہے۔ 1959ء میں ذاکر صاحب اردو کے دوسرے گہوارے بہار کے گورنر بنے جو نہ صرف اردو آبادی کا اہم ترین صوبہ ہے بلکہ جہاں آہستہ روی سے ہی سہی، مگر اردو نے اپنے آئینی حقوق کی جدوجہد میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنی تمام تر اچھائیوں اور خوبیوں کے باوجود اکثر بے وقت کا راگ ہوتی ہے، مگر تاریخ ایک ناگزیر حقیقت کا نام بھی ہے اور اکثر بے وقت کی راگنی سے بالاتر ہو کر حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بھی قوموں کو تاریخ ہی دیتی ہے۔ ذاکر صاحب کے حوالے سے ہم آج فروغ اردو کے ذیل میں تاریخ سے یہ کام لے سکتے ہیں کہ اردو والے ماضی کے آسیب سے اپنا پیچھا چھڑا لیں۔ تاریخ کے اس عمل کی اہمیت کا اندازہ ذاکر صاحب کو بھی تھا، ورنہ 1952ء کی اردو تحریک شروع ہی نہ ہوئی ہوتی۔

تقسیم کے بعد شمالی ہند خصوصاً اتر پردیش میں اردو لسانی اقلیت کی تاریخ دو انتہاؤں کی داستان ہے: ایک پسپائی کی انتہا تو دوسری شدت پسندی کی۔ من حیث القوم اردو والوں نے تقسیم کے بعد ان صوبوں میں جس غیر متوقع پسپائی کا مظاہرہ کیا اس کے نتیجے میں اردو والوں ہی کے ایک مختصر گروہ کی طرف سے نظریاتی شدت پسندی کا مظاہرہ لازمی تھا۔ پسپائی کا ماحول اگر عام نہ ہوتا تو اس نظریاتی شدت پسندی کی شاید صحیح توضیح کی جا سکتی تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا اور نظریاتی شدت پسندی نے عوامی انفعالیت کی تمام تر ذمے داری اردو لسانی اقلیت کے ان رہنماؤں کے سر منڈھ دی جو کانگریس کے قریب تھے۔

میں تقسیم کی تاریخ اور اس کے اسباب کی کسی تفصیل میں جانے کا خواہاں نہیں مگر ایک امر کی طرف اشارہ لازمی ہے کہ تقسیم کے بعد اردو لسانی اقلیت کے ہندستان میں رہ جانے والے قومی حیثیت کے دو رہنماؤں میں ایک ذاکر صاحب تھے جن کی خاموشی نے خود ان کے حالات خاصے خراب کیے۔ دوسرے مولانا آزاد تھے جن کی مقبولیت کا اہم ترین راز ان کی بے باکی بھی تھا۔ یہاں مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کا موازنہ کسی بھی طرح مقصود نہیں، مگر تاریخ کی اس سفاکی کو کیا کہیے کہ تقسیم کے بعد یہی دو قومی رہنما ہندستان میں موجود تھے جن میں خالص تعلیمی فراست کے مرد میداں ذاکر صاحب کی زندگی کا اختتام ایسے قومی سیاسی رہنما کے طور پر ہوا جس سے مسلمانوں کو شکایتیں تھیں اور ہیں۔ دوسری طرف سیاسی طور پر کہیں زیادہ زیرک مولانا آزاد نے قومی سیاست کے مشاق شناور کی طرح وزارت تعلیم کا قلم دان سنبھالا اور قومی سیاسی زندگی کا اہم جز بننے کے باوجود وہ اپنی مسلم دوستی کی شبیہ برقرار رکھ پائے۔ ایسا کیوں ہوا اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ ایک سامنے کی تاویل ہے مگر اس سے بات اور الجھ جاتی ہے۔ مولانا نے خود کو کبھی بھی صرف اور صرف مسلمانوں کا لیڈر تصور نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں نے انھیں اس کا موقع دیا۔ ان کی یہ امیج آج بھی برقرار ہے۔ مگر مولانا کے بعد جن مسلمانوں نے خود کو ہندستان کے قومی تناظر میں سیاست داں کے طور پر رکھنا چاہا ان کو نہ تو ہندوؤں نے قومی رہنما تصور کیا اور نہ ہی مسلمانوں نے انھیں قومی یا مسلمان لیڈر کے طور پر قبول کیا۔ کم و بیش یہی حال خالص مسلم سیاست کرنے والوں کا ہوا۔ اس معمے کا جواب شاید ہندستانی ذہن کے مزید مطالعے میں مضمر ہے۔

اردو کے سیاق و سباق میں بھی یہ بات دل چسپ ہے کہ آزادی کے بعد مولانا نے کبھی اردو کا سوال اس طرح نہیں اٹھایا جو اس مسئلے کو اس کی فلسفیانہ اساس یعنی ہندی۔ اردو تنازعے کی روشنی میں دیکھنے کی طرف اردو والوں کو راغب کرتا۔ آج ہندی مسلمانوں کو مولانا سے اردو کے باب میں کوئی شکوہ بھی نہیں۔ دوسری طرف ذاکر صاحب نے اردو کے لیے اتر پردیش کی علاقائی زبان کا مطالبہ کر کے ایک طرح سے مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

صدر جمہوریہ کے طور پر ذاکر صاحب کے لیے اردو کی حمایت ایک مشکل امر تھا۔ فرض کیجیے کسی مقدمے میں پیش ہونے والا کوئی وکیل اگر جج بن جائے تو وہ اپنے سابق موکل کے حق میں کیا صرف اس لیے فیصلہ دے گا کہ ماضی میں وہ اس کا وکیل تھا؟ اردو کا پورا مسئلہ سیاسی تھا اور ہے۔ ذاکر

صاحب نے اس سوال کو سیاسی سوال کے طور پر ہی اٹھایا تھا۔ ہمدردان اردو کے لیے ضروری تھا کہ وہ ذاکر صاحب کے گورنر بن جانے کے بعد اس سیاسی سوال کو عوامی تحریک کے ذریعے آگے بڑھاتے۔ مگر اردو لسانی اقلیت نے بحیثیت مجموعی وہ حوصلہ دکھایا ہی نہیں جو ایسی لیڈر شپ پیدا کر سکتا کہ مسئلہ سیاسی قوت کے ساتھ آگے بڑھتا اور پھر حل بھی ہو جاتا۔

ذاکر صاحب نے انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے 1952ء میں اردو کو آئین کی دفعہ 347 کے تحت اتر پردیش کی علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ ذاکر صاحب اُس وقت مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ تھے۔ یہ مسئلہ (یعنی 1952ء میں مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کا آئین کی دفعہ 347 کے تحت اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ) تقسیم کے بعد رونما ہونے والے حالات کے پس منظر میں بے حد پیچیدہ معاملہ تھا۔ ایک لابی بہ شمول مذہب اور ہندو شافت، ہندی کو عرصۂ دراز سے اس سیاسی مسئلے میں شامل کرنا چاہتی تھی جو اسے اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا سکے۔ شمال کی دیگر تمام زبانوں کو اس نئی زبان ہندی ہی کی شکل قرار دے کر ایک منظم سیاسی تحریک کے ذریعے شمالی ہند کی ایک لابی اپنے اس مقصد میں تقسیم ہند کی وجہ سے پوری طرح کامیاب ہو گئی۔ اقتدار اس کے پاس آجانے کے بعد سوال صرف یہ باقی تھا کہ اقتدار رہے کس لابی کے پاس۔ کانگریس کے اندر اقتدار کی کش مکش نہرو بنام غیر نہرو میں جاری تھی۔ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نہرو کے ہم نوا تھے۔ ذاکر صاحب کا شیخ الجامعہ بن کر علی گڑھ جانا اور اردو کو اتر پردیش کی دوسری علاقائی زبان قرار دینے کی تحریک چلانا یقیناً کانگریس کی اندرونی سیاست کا نتیجہ تھا مگر یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اپنے وزرائے اعلا پر نہرو کا ایسا دبدبہ نہ تھا جو بعد میں اندرا گاندھی نے قائم کیا۔ خصوصاً یو پی کے وزیر اعلا اور اس صوبے کے متعدد وزرا تک، نہرو کے مشورے کو در خور اعتنا تصور نہ کرتے تھے۔ ایسے میں اردو کی تباہی کے معاملے میں مرکزی حکومت کے سربراہ کے طور پر نہرو خود کو شمالی ہند کے صوبائی وزرائے اعلا کے سامنے بے بس تصور کرتے تھے۔

اس امر میں شک کی گنجائش نہیں کہ ذاکر صاحب کی تحریک کانگریس اور نہرو کے ایما پر شروع کی گئی تھی مگر اردو والے صرف ذاکر صاحب کے ہاتھوں کسی کرشمے کی امید میں بیٹھے رہے۔ اردو لسانی اقلیت نے جب اس تحریک کے لیے خود ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے تو نہ صرف مرکز نے اردو والوں کی مدد کرنے سے خود کو قاصر پایا بلکہ ذاکر صاحب نے بھی خود کو اردو اور مسلمانوں کی اس طرح خدمت سے معذور تصور کیا جس راہ پر چل کر وہ ان کے مسائل کے حل کے لیے پیش رفت کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے خلاف فتنہ پردازیاں شروع ہو گئیں اور اُسی وقت سب سے حوصلہ شکن سانحہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد انتقال کر گئے۔ خود ذاکر صاحب کی صحت بھی جواب دے رہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے بہار کے گورنر کا عہدہ قبول کر لیا جو اس وقت کے حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس دور کے حالات کی غمازی ذاکر صاحب کے اس خطبۂ الوداعی میں موجود ہے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو خیرباد کہتے ہوئے دیا تھا۔ ان حالات میں ذاکر صاحب نے جو کیا اس سے زیادہ اردو اور مسلمانوں کے لیے کوئی بھی سیاست داں شاید نہیں کر سکتا تھا۔ بہار کے گورنر کے طور پر انھوں نے خدا بخش لائبریری کو ایسا تحفظ فراہم کرایا کہ وہ آج مشرقی دنیا کا اہم ترین کتب خانہ ہے۔ مگر حالات کو مجموعی تناظر میں دیکھنے کی فہم سے عاری ہندی مسلمان اُس وقت سے آج تک ان حالات کا صحیح تجزیہ کر ہی نہیں پائے جن کے سبب شمالی ہند میں اردو تباہ ہوئی۔

اتر پردیش اور شمال کی دیگر ریاستوں میں اردو کی حالت آج بھی وہی ہے جو 1947ء میں تھی بلکہ مزید بدتر ہوئی ہے۔ آئین کی دفعہ A 350 جو مادری زبان میں پرائمری تعلیم کی ہدایت صوبوں کو دیتی ہے، SPECIAL DIRECTIVES کے تحت آتی ہے، جسے ماننے کے لیے صوبے مجبور نہیں۔ دفعہ 345 کے تحت دوسری سرکاری زبان کا درجہ بہار میں ثابت کر چکا ہے کہ اس کی حیثیت کچھ کم ایک ہزار مترجمین کے تقرر سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد دوسری سرکاری زبان کا درجہ اردو کو اتر پردیش میں مل بھی جائے تو اس سے ہوگا کیا؟ آئین کی دفعہ 347 جس کی ذاکر صاحب کی تحریک کے سیاق و سباق میں بے حد اہمیت ہے، پہلے اپنی کسی قابلِ عمل تشریح کے لیے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ میں قانونی لڑائی، اور پھر اس کے نفاذ کے لیے عوامی تحریک کے ذریعے کوششوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آئین کے طریقِ کار پر نظر ثانی کرنے والے کمیشن نے (Commission to review the Working of the Constitution) جسے عرفِ عام میں جسٹس وینکٹ چلیا کمیشن بھی کہا جاتا ہے، آئین کی دفعہ 347 کی قابلِ عمل توضیح کر کے اس میں ترمیم کی سفارش کی ہے۔ آئین کے طریقِ کار پر نظر ثانی کرنے والے کمیشن نے آئین کی دفعہ 347 میں لفظ قابلِ ذکر آبادی (Substantial proportion of the Population) کی توضیح کا اہم ترین کام ڈاکٹر اطہر فاروقی کی درخواست پر کیا۔ اطہر فاروقی نے 25 اپریل 2001 کو کمیشن کے چیئرمین کے سامنے پیش ہو کر اس سلسلے میں انھیں اپنے دلائل سے قائل کیا اور تحریری میمورینڈم دیا جس کا متن ماہنامہ مسلم انڈیا کے فروری 2002 کے شمارے میں صفحہ 65 پر شائع ہوا ہے۔

اس کمیشن نے اطہر فاروقی ہی کے ایک دوسرے میمورینڈم پر بھی اپنی سفارشات پیش کر کے آئین میں ترمیم کی تجویز پیش کی ہے جو اردو ذریعہ تعلیم اور اردو کے فروغ کے سیاق و سباق میں اہم ہوگی۔ یہ دوسرا میمورینڈم 16 اگست 2001 کو دیا گیا اور اس کا متن بھی مسلم انڈیا میں فروری 2002 کے شمارے میں صفحہ 65 پر شائع ہوا ہے جو درج ذیل ہے:

"1: اردو کے مسئلے کو دیگر ہندستانی زبانوں کے مسائل کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے کیوں کہ ہندی بولنے والے بھی اُن صوبوں میں لسانی اقلیت ہیں جہاں دوسری زبانوں کے بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ اس ذیل میں میرے معروضات درج ذیل ہیں: [آئین کی 93 ویں ترمیم کے مطابق] بچے کی 14 برس تک کی مفت تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اس ذیل میں اپنے تاریخی فیصلے میں سپریم کورٹ نے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے جانے کے سلسلے میں کوئی رائے نہیں دی ہے اور یہ صاف نہیں ہے کہ 14 برس تک مفت اور لازمی تعلیم کا ذریعہ کیا ہوگا۔ یہ سوال اس لیے زیادہ اہم ہے کہ بالعموم ریاستیں اس زبان میں تعلیم کا انتظام سرکاری اسکولوں میں کرتی ہیں جو زبان ریاست کی اکثریت بولتی ہے مگر اس صورت میں ہر صوبے میں لسانی اقلیتیں [خصوصاً اردو لسانی اقلیت] مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محروم ہو جائیں گی۔

2: آئین کے دفعہ 350A جو ریاستوں کو مادری زبان میں تعلیم کی ہدایت دیتی ہے، Special Directives کی مبہم شق کے ذیل میں آتی ہے جسے ماننے کے لیے ریاستیں مجبور نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کے حق کو آئین کے تیسرے حصے (Part III) میں بنیادی حق (Fundamental Right) کے طور پر شامل کیا جائے۔

3: لسانی اقلیتوں کا کمیشن آئینی حیثیت کے باوجود ایک بے بس ادارہ ہے جس کی آواز پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ صوبائی حکومتیں لسانی اقلیتوں کے کمیشن کو لسانی اقلیتوں کے متعلق اپنی ریاستوں کے ضروری اعداد و شمار تک بھیجنے کی زحمت نہیں کرتیں حالاں کہ یہ اعداد و شمار بھی صرف کاغذی خانہ پُری کے ذیل میں آتے ہیں کیوں کہ لسانی اقلیتوں کے تئیں ریاستی حکومتیں خصوصاً شمالی ہند میں بے حد سوتیلا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ لسانی اقلیتوں کی رپورٹ حالانکہ پارلیمنٹ میں پیش کی جاتی ہے مگر اس پر نہ تو کبھی بحث ہوئی اور نہ ہی اس کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں کبھی سوچا گیا۔"

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ معاصر ہند میں اردو کا ایجنڈا ہو کیا اور اسے کس طرح ترتیب دیا جائے؟

ذاکر صاحب ہوں یا گاندھی جی، زبان و تعلیم سے متعلق ان کے فارمولے اب زیادہ پر اثر نہیں رہے۔ گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں اگر گاندھی جی کی ہندستانی بھی قومی زبان ہوتی تو اس کا حشر بھی کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ ہم سیاسی نعرے لگاتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اکابرین کے نظریات کی اہمیت ان نظریات کی روح میں ہوتی ہے، ان کے لفظی انطباق میں نہیں۔ یقیناً وردھا اسکیم کی اب کوئی اہمیت نہیں۔ خود ذاکر صاحب اگر حیات ہوتے تو وہ وردھا اسکیم کا نئے زمانے سے ہم آہنگ نیا قالب مرتب کرتے۔ اسی طرح اردو کے معاملے میں سرسید کے نظریات کی روح کے زیر اثر وہ کہتے کہ اردو کو لازمی مضمون مگر زبانِ اول کی حیثیت سے تہذیب و تشخص کے تحفظ کا وسیلہ بنا کر انگریزی ذریعہ تعلیم کو اختیار کیا جائے۔

لہٰذا اکیسویں صدی میں اردو تعلیم کے ایجنڈے کے سیاق و سباق میں کہا جاسکتا ہے کہ جن طلبہ کو انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہے وہ ضرور انگریزی میڈیم میں جائیں مگر جو انگریزی میڈیم میں نہیں جاسکتے انھیں آئین کی 93 ویں ترمیم کے مطابق 14 برس تک تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ مگر اردو کے سیاق و سباق میں ہمیں اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اردو کا نصاب کسی بھی دوسری ہندستانی زبان کے نصاب سے کمتر درجے کا نصاب ہے۔ یوں اردو میڈیم خود اردو والوں کے درمیان علاقائی زبانوں کے مقابلے میں بھی ترجیح حاصل نہیں کرپاتا۔

اردو کا نصاب این سی ای آر ٹی اور ایس سی آر ٹی سمیت بیشتر اداروں میں انگریزی اور علاقائی زبانوں سے ترجمہ ہوتا ہے اور ترجمے کی زبان انتہائی مہمل ہوتی ہے۔ اس طرح اردو میڈیم کے اساتذہ بھی علاقائی زبانوں کے ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں B.Ed. وغیرہ کرتے ہیں۔ میرے ان معروضات کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ ان تمام حد بندیوں کے باوجود اردو میڈیم کو خیرباد کہہ دیا جائے مگر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اردو تعلیم کا پورا انتظام ایک نئے قالب کا طالب ہے۔

چنانچہ اردو لسانی اقلیت و ہمدردانِ اردو کا یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ تمام سرکاری اسکولوں میں، بشمول سینٹرل اسکول، نودیہ ودیالیوں، اردو میڈیم سے بھی تعلیم کا انتظام ہو (کہ یہ اردو والوں کا آئینی حق ہے) اور دیگر اسکولوں میں چوتھے درجے سے اردو کو بطور اختیاری مضمون (پہلی اور لازمی زبان کے طور پر) پڑھنے کی سہولیات فراہم ہوں۔

□□□

Centre for Indian Languages
School of Language,
Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

ارتقا شیخ

اردو کی تعلیم اور ہماری نئی نسلیں

اردو کی تعلیم کی دو صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ طلبہ اردو کو بہ طور میڈیم اختیار کریں اور دوسری یہ کہ اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔ تعلیمی ماہرین کا یہ عام خیال ہے کہ بچے کی ذہنی نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو۔ اس سے تعلیمی عمل میں اس کی دل چسپی بھی قائم رہے گی اور ابتدائی مرحلے پر ہی کوئی اجنبی نئی زبان سیکھنے کی مشقت اس میں جو بددلی پیدا کر سکتی ہے، اس سے وہ محفوظ رہے گا۔ اصولی طور پر یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے نصاب کو مسلسل اَپ ڈیٹ کیا جاتا رہے۔ ہندستان کی حد تک مگر افسوس ناک صورتِ حال یہ ہے کہ گزشتہ پچپن برسوں میں اردو میڈیم کے نصاب کو اس لیے اَپ ڈیٹ نہیں کیا گیا کیونکہ نئے علوم کی اصطلاح سازی اور پرانی اصطلاحوں کو جو نا قابلِ حد تک عربی اور فارسی زدہ تھیں، نئے لسانی اور سماجی منظر نامے کے پیشِ نظر از سر نو ترجمہ نہیں کیا جا سکا۔ نتیجہ آج بھی دارالترجمے کی ایسی اصطلاحیں ہندستان میں اردو میڈیم کی کتابوں کا حصہ ہیں جن میں سے کئی کا تلفظ طلبہ تو کیا اساتذہ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اردو تعلیم اور نصاب سازی کے عدم تسلسل کی وجہ سے ہمارے یہاں مختلف علوم کے وہ اساتذہ ہی ناپید ہو گئے جو نئی اصطلاحیں وضع کر سکتے اور نیا دلکش اور بامعنی نیز تعلیم کی بدلتی ضرورتوں سے ہم قدم نصاب تیار کرنا جن کے دائرۂ اہلیت میں ہوتا۔

لیکن موجودہ زمانے نے ہندستان سے باہر ایک اور حقیقت کو بھی جنم دیا ہے۔ ایسے ہزاروں بچے ہیں جن کی مادری زبان روایتی طور پر اردو ہے لیکن ان کے خاندان بہتر معاش کے لیے دنیا کے دور دراز خطوں میں جا بسے ہیں جہاں اردو میڈیم سے انھیں تعلیم دلانا بہ حالاتِ موجودہ خاصا مشکل کام ہے۔ اتنا مشکل کہ فی الحال اسے ناممکنات کے درجے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان بچوں کے والدین اپنی تہذیبی شناخت کے تسلسل کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان کے بچے اردو سے ناواقف نہ رہیں۔ ایسے بچوں کو اردو بہ طور ایک اختیاری مضمون پڑھانے کا نظم کیا جا سکتا ہے۔

بیشتر مغربی ممالک میں جہاں اردو زبان والے جا بسے ہیں، جمہوری نظام قائم ہے اور وہاں کی منتخب حکومتیں خواہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی کی نمائندگی کرتی ہوں، لسانی اور تہذیبی معاملات میں زیادہ تنگ نظر نہیں ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں اردو والوں نے مطالبہ کیا ہے وہاں وہاں بیشتر صورتوں میں ان کی نئی نسلوں کے لیے سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔ مغرب میں برطانیہ کے علاوہ امریکہ دوسرا بڑا ملک ہے جہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں جن کی مادری زبان اردو رہی ہے۔ ان ملکوں میں ان کے بچوں کے لیے اردو تعلیم کی سہولتیں تھوڑی بہت فراہم کر بھی دی گئی ہیں۔ دو اسکینڈی نیوین ممالک ناروے اور ڈنمارک میں بھی اردو والے خاصی تعداد میں جا بسے ہیں، اور وہاں کی حکومتوں نے اردو کے حوالے سے خاص فراخدلی بھی دکھائی ہے۔ کوئی بھی سرکاری اسکول جہاں اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ موجود ہوں، اردو کلاس کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ ان ممالک میں اردو والے اپنے بچوں کو نجی طور پر بھی اردو پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں اور بہت سی جگہوں پر شبینہ کلاسیں بھی چلائی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ ملکوں میں سرکاری طور پر اردو بہ طور ایک زبان کے ہی پڑھائی جا سکتی ہے، اردو میڈیم کے ذریعے تعلیم عملاً مشکل بھی ہے اور خود اردو والے بھی اپنے بچوں کے لیے اردو تعلیم کی سہولت کے طلب گار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ صاف ہے، جو بچے غیر ممالک میں پیدا ہوئے، وہیں کے لسانی ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں، ان کے لیے متعلقہ ملک کی عام زبان ہی مادری زبان کی قائم مقام ہے اور اسی زبان کے میڈیم سے وہ ابتدائی سے اعلا مدارج تک کے تعلیمی مراحل بہتر طور پر طے کر سکتے ہیں؛ مگر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو والوں میں اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کا جذبہ اس طرح موجود نہیں جس کی کار فرمائی ہمیں جنوبی ہند کے لوگوں یا بنگلہ مادری زبان والوں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ دنیا میں کہیں بھی رہیں کتنے ہی بڑے اور مہنگے اداروں میں ان کے بچے تعلیم حاصل کریں مگر ان کے بچے نہ صرف اپنی مادری زبان کی تحریری شکل سے واقف اور اس میں موجود ادب اور اپنی ثقافت کے دلدادہ ہوتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے گھروں میں صرف اپنی زبان بولی جاتی ہے جو مادری زبان ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ جذبہ اردو والوں میں مفقود ہے۔

تو پھر انھیں اردو کیوں پڑھائی جائے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس طرح ان کے والدین، اردو جن کی متاعِ عزیز ہے، اپنی نفسیاتی تسکین کا سامان کرتے ہیں کہ جس ثقافتی روایت کے وہ امین رہے ہیں اسے اپنی نئی

نسلوں تک منتقل کریں۔ لیکن اس سوال کا ایک دوسرا جواب بھی ہے جو شاید زیادہ بامعنی ہے۔ اردو برِ صغیر میں ایک تہذیبی شناخت کی حامل رہی ہے جس کا سب سے طاقت ور عنصر غیر منقسم ہندستان میں ہر سطح پر اردو تعلیم کا نظم تھا جس میں اردو ذریعہ تعلیم اور اردو کا مطالعہ پہلی اور دوسری زبان کے طور پر شامل تھا۔ اس تہذیبی شناخت کی تشکیل و ترویج میں ہمارے بزرگوں کا خونِ جگر صرف ہوا ہے۔ ثقافتی اور عملی سطح پر ان بزرگوں میں صوفی سنت بھی ہیں، علما فضلا بھی اور ادبا اور شعرا بھی۔ اگر ہماری نئی نسلیں اردو سے نابلد رہ جاتی ہیں تو وہ اس عظیم علمی، ادبی، فکری سرمایے سے محروم ہو جائیں گی جس نے ہمیں ذہنی تونگری بھی عطا کی ہے اور جذباتی سطح پر بھی ثروت مند بنایا ہے۔ یہ معمولی محرومی نہیں ہوگی اور اگر خدانا کردہ یہ ہماری نئی نسلوں کا مقدر ٹھہرتی ہے تو ہم انھیں اپنا وارث کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے، مگر اس کے ذمّے دار صرف اور صرف ہم ہوں گے۔ لہٰذا اس صورت میں بھی، جب اردو کو بہ طور ذریعہ تعلیم اختیار کرنا ممکن نہ ہو، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو بہ طور زبان پڑھائیں اور ان میں اس زبان کی اتنی استعداد ضرور پیدا کر دیں کہ وہ جب چاہیں حسبِ استطاعت اس زبان کے علمی نہ سہی کم از کم ادبی خزانے سے استفادہ کر سکیں۔ اس کی عظیم ثقافت سے واقف ہو سکیں۔

مغربی ممالک کے علاوہ اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں بھی جا بسی ہے جہاں کی زبان عربی ہے۔ عربی بھی ایک غیر ملکی زبان ہے لیکن انگریزی کے برعکس اردو والوں کے لیے کوئی اجنبی زبان نہیں۔ عربی کے سینکڑوں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں اور یہ استعمالات اردو روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اردو بولنے والے مسلمانوں کے لیے عربی سے قربت کا ایک بڑا وسیلہ قرآن پاک بھی ہے جو ہر مسلم گھرانے کے بچے ابتدا ہی میں پڑھ لیتے ہیں۔ پھر ہندستان اور پاکستان میں سینکڑوں دینی مدارس ہیں، عربی زبان کا مطالعہ جن کے تعلیمی نصاب کا لازمی حصہ ہے۔ سعودی عرب کی حد تک اس تصویر کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے ہم معکوس پہلو بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان تارکینِ وطن کے علاوہ جو وہاں جا بسے ہیں، ہر سال حج کے دنوں میں ہندستان اور پاکستان کے لاکھوں زائرین زیارتِ حرمین شریفین کے لیے مکّے اور مدینے جاتے ہیں، لگ بھگ ایک مہینے وہاں قیام کرتے ہیں اور واپسی کے وقت بہت سے تحفے تحائف بھی مقامی تاجروں سے، جو زیادہ تر عرب ہوتے ہیں، خریدتے ہیں۔ اپنے لاکھوں خریداروں سے بہتر معاملات کے لیے عرب دکاندار کوشش کرتے ہیں کہ وہ انھی کی زبان میں ان سے بات کریں۔ اس لیے تھوڑی بہت اردو کی شُدھ بُدھ پیدا کر لینا ان کے لیے ایک کاروباری تقاضا ہے۔ ایامِ حج کے علاوہ بھی سال بھر تک ہندستانی اور پاکستانی زائرین ان مقدس مقامات کی زیارت کے لیے وہاں جاتے رہتے ہیں، اس لیے اردو وہاں بول چال کی ایک ثانوی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

عمان، دُبئی اور دوحہ میں بھی اچھا خاصا اردو کا ماحول پیدا ہو گیا ہے اور شعری اور ادبی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ اردو کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے ان ریاستوں کو اپنا مستقر بنا لیا ہے۔ تینوں جگہ سالانہ عالمی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور دُبئی کی بزمِ ادب ہر سال ہندستان اور پاکستان کے ادیبوں کو بڑے بڑے ایوارڈ بھی دیتی ہے — لیکن اس صورتِ حال کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہاں ہم اہلِ اردو قدرے تن آسانی اور خود اطمینانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ شعری بزم آرائیاں اور ادبی انجمن سازیاں اپنی جگہ، ان کی معنویت اور افادیت بھی مسلّم لیکن اس گہما گہمی میں اصل مسئلے کو پس پشت ڈال دینا مناسب نہیں اور اصل مسئلہ نئی نسلوں کے لیے اردو کے تدریسی نظم کا ہے جس کی طرف تا حال کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

یورپی ممالک ہوں یا عرب ممالک ہوں جہاں اردو ایک نو وارد زبان ہے یا ہندستان اور پاکستان جو اردو کا اصل وطن ہے، بنیادی اہمیت اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کے معقول نظم کی ہے۔ ہندستان اور پاکستان میں زیادہ زور اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ اور استحکام پر دینے کی ضرورت ہے اور بیرونِ ممالک میں جہاں جہاں بھی اردو والے جا بسے ہیں، وہاں یہ انتظام ہونا چاہیے کہ ان کے بچے اردو کو ایک زبان کے طور پر پڑھیں اور اس میں اتنی استعداد بہم پہنچائیں کہ اس زبان میں موجود ادبی سرمایے سے اور جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، مستفیض ہو سکیں۔ اگر ایسا ہو سکا تو ہم کہہ سکیں گے کہ ہماری زبان کے تئیں اس زبان کے پروردہ شعر و ادب اور اس زبان کی ترجمان اور پاسبان تہذیب کے تئیں جو ہماری ذمّے داری تھی اُسے پورا کرنے میں ہم کامیاب رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ ہماری غفلت اور بے عملی سے ایسا نہ ہو سکا تو اپنی زبان کے تئیں ہمارے تمام دعوے بے اساس ٹھہریں گے۔

وقت کبھی کسی کی خاطر رکا نہیں اور جو وقت ہمیں ملا ہے اس کی تیز رفتاری کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی زبان کی بقا اور اپنے تہذیبی تشخص کی برقراری کے لیے جو کرنا ہے وہ بلا تاخیر کر گزرنا چاہیے۔ وقت آگے نکل گیا تو ہم اسے واپس نہ لا سکیں گے۔ زبان زدِ عام شعر ہے مگر اس موقعے پر بے ساختہ میری زبان پر آ رہا ہے:

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

28, Fairfield Drive, Harrow Middx, HAL 6 PY,U.K.

عبدالعلیم قدوائی

ملک کی معیشت میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی نمایاں پیش رفت

آج ہماری معیشت میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حیثیت ایسے ترقی لانے والے انجن کی ہے جو معاشی، سماجی اور ملکی خوشحالی و فلاح کے لیے مسلسل قابلِ تعریف خدمتیں انجام دے رہا ہے۔ چھوٹی صنعتوں کا پروگرام باقاعدہ طور پر ہمارے ملک میں 56-1955 سے شروع ہوا۔ حکومتِ ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندستان جیسے عظیم ملک میں جہاں بے انداز وسائل، خاصی تعداد میں اچھے اور باصلاحیت کاریگر، صناع اور دست کار پائے جاتے ہیں، چھوٹی صنعتیں کم سرمایے سے ہر جگہ اور ہر طبقے کے لوگوں کے لیے آسانی سے لگائی جاسکتی ہیں اور اس وقت سے لے کر آج تک سرکار اس زمرے کی ہر ممکن سرپرستی اور مدد کر رہی ہیں۔ اس کا شمار ترجیحی زمرے میں ہے اور مرکزی و ریاستی حکومتیں، ان کی ترقیاتی کارپوریشنیں، بینک اور ملک کے صنعت کار اور دانشور برابر اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں چھوٹے صنعت کاروں کا ایک معزز اور مستحکم طبقہ وجود میں آگیا جس نے ملک کو نہ صرف خوشحال بنایا بلکہ معاشی طور پر اس کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا اور آج ہندستان کا شمار ترقی پذیر ملکوں کے لیڈروں میں کیا جاتا ہے۔ اس وقت چھوٹی صنعتیں پورے ملک کی صنعتی پیداوار کا 40% حصہ تیار کرتی ہیں اور برآمد میں ان کا حصہ پورے ملک کا 35% ہے۔ تقریباً 35 لاکھ سے زائد اکائیاں ملک میں کام کر رہی ہیں اور دو کروڑ افراد کو روزگار فراہم کر رہی ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اس زمرے کی وسعت اور معاشی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی اور فروغ کے لیے حکومت کی پالیسی لگاتار مثبت رہی ہے جس کے تحت انھیں ہر قسم کی امداد مختلف اداروں سے دی جاتی ہے۔ خاص کر ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہمارے بینک بروقت مستعد رہتے ہیں۔ ان صنعتوں کو چلانے کے لیے دیگر ضروریات کی فراہمی جیسے زمین یا بنے بنائے کارخانے کی عمارت، مشینیں، ٹیکنیکل معاملات میں رہنمائی اور ضروری معلومات، بجلی پانی کی فراہمی، سرکاری محکموں کو ضروری اشیا کی سپلائی وغیرہ کے لیے ایک باقاعدہ اور منظم ڈھانچہ قائم ہے۔ اگست 2000 میں وزیر اعظم نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ایک جامع و مانع مثبت پالیسی کا اعلان کیا جس کے خاص خاص نکات یہ ہیں:

1- چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں زیادہ سے زیادہ سرمایے کی حد ایک کروڑ روپے مقرر کی گئی۔

2- ان میں سے جو صنعتیں اور زیادہ چھوٹی ہیں اور جن کو Tiny Sector میں شمار کیا جاتا ہے، ان میں سرمایہ کاری زیادہ سے زیادہ 25 لاکھ روپے تک کی جاسکتی ہے۔

3- چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے اکسائز ڈیوٹی میں چھوٹ پچاس لاکھ سے بڑھا کر ایک کروڑ روپے کر دی گئی۔

4- اس زمرے کی اکائیوں کو زیادہ فعال بنانے کے لیے جلد ہی سرکار ایک لمیٹڈ پارٹنرشپ ایکٹ منظور کرائے گی۔

5- بینکوں کی طرف سے دیے گئے مجموعی قرض (Compoite Loans) کی حد دس لاکھ روپے سے بڑھا کر 25 لاکھ روپے کر دی گئی۔

6- ان صنعتوں کی جو اکائیاں صنعت سے متعلقہ سروسنگ یا کاروبار کرتی ہیں ان کو ترجیحی زمرے میں شامل کر لیا گیا بشرطیکہ ان میں دس لاکھ روپے سے زیادہ سرمایہ نہ لگا ہو۔

7- نائک کمیٹی کی سفارشات کے بموجب چھوٹی صنعتوں کی اکائیوں کو ان کے مجوزہ پیداواری نشانے کا 20 فی صد حصہ چالو پونجی کی ضرورتوں کے لیے بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے فراہم کریں گے۔

8- صنعتی بستیوں کے معیار کو بلند کرنے اور ریاستی مالیاتی کارپوریشنوں کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے پلاننگ کمیشن اور معاشی امور کے محکمے سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ضروری قدم اٹھائے جائیں گے۔

9- مزید برآں چھوٹی اکائیوں کی پیداوار کی کوالٹی بڑھانے، ان کو اپنی مصنوعات کی نکاسی اور ٹیکنیکل معلومات اور کارکردگی میں اضافے کے لیے مناسب اور ضروری کاروائی کی جائے گی۔

10- اسی کے ساتھ ہی دیہی علاقوں میں موزوں صنعتوں کو فروغ دینے، چھوٹے صنعت کاروں کی مہم جوئی اور کام کرنے والے افراد کی صلاحیت بڑھانے کے لیے مناسب ٹریننگ اور دیگر ضروری وسائل کو مہیا کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

اس پالیسی سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری حکومت اس زمرے کی اہمیت اور صلاحیت کو بخوبی سمجھتی ہے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھتے وقت معاشی ضوابط میں نرمی، عالمی تجارتی تعلقات میں زبردست اضافے اور

کوالٹی کے بارے میں بھرپور مقابلے اور مسابقت کے جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان کے پیش نظر ایسی ہی فراخ دلانہ پالیسی کی ضرورت تھی۔ اب تک ہر چھوٹی چیز کے حسن کی تعریف کی جاتی تھی۔ مگر اب یہ کہنا ہوگا کہ چھوٹی صنعتوں کا زمرہ نہ صرف حسین و دلکش ہے بلکہ وہ غضب کی استقامت اور طاقت بھی رکھتا ہے۔ ہمارے ملک کی معاشی تاریخ میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی بے مثال طور پر شاندار ہوئی ہے اور گزشتہ 47-46 سال میں اس زمرے نے ہر دائرے میں عزت و فخر کا مقام حاصل کیا ہے۔

چھوٹی صنعتوں کو لگانے اور چلانے میں چند خاص آسانیوں کا ذکر ضروری ہے۔ یہ صنعتیں ملک کے کسی بھی حصے میں لگائی جاسکتی ہیں، ان کے لیے زیادہ سرمایہ، ٹیکنکل واقفیت کی ضرورت نہیں پڑتی، ان اکائیوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے، خاص کر حدِ افلاس کے نیچے رہنے والوں کو؛ خا[illegible]ت میں ہمارے کسان بھائی، خواتین سبکدوش فوجی، معذور افراد ایسی اکائیاں لگا کر اپنی آمدنی اور اسی کے ساتھ ہی ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ ان صنعتوں کی مصنوعات سے ملک کی برآمدات برابر بڑھتی رہتی ہیں۔ ان کے ذریعے عالمی برادری کے دیگر ملکوں خاص کر پچھڑے ہوئے ترقی پذیر ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ نئی نئی مصنوعات کے ذریعے ہمارے صنعت کاروں، کاریگروں اور مزدوروں میں خود اعتمادی اور ولولے کی ایسی لہریں دوڑ جاتی ہیں جو زندہ اور آزاد قوم کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ان صنعتوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ کاروبار، تجارت، بینک کاری اور نہ معلوم کتنے اضافی اور ضمنی اداروں میں ترقی ہوتی ہے اور ان کا کام بڑھتا جاتا ہے۔ مقابلے اور مسابقت کے صحت مندانہ رجحانات سے صنعت کاروں، دانشوروں، تاجروں اور دیگر متعلقہ افراد کو بے انتہا فائدہ پہنچتا ہے۔

چھوٹی صنعتوں کے ساتھ ساتھ کھادی اور دیہی صنعتوں میں بھی برابر ترقی ہو رہی ہے اور تاریخی اعتبار سے یہ زمرہ ہم کو اپنے ملک کے زریں ماضی کی جھلک دکھاتا ہے، جب دیہاتی علاقوں میں پورے طور پر امن و شانتی تھی اور ہر گاؤں معاشی اعتبار سے ایک نمائندہ اکائی تھا۔ یہاں کی زندگی سادگی اور انسان کی اصل فطرت کی عکاسی کرتی تھی اور عوامی اخلاق و کردار ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس اہم اور تاریخی زمرے کو فروغ دینے کے لیے بھی ہماری سرکار نے ایک مثبت پالیسی کا اعلان کیا جس کے تحت ان اکائیوں کی پیداوار کو ترقی دینے، فروخت کرنے، کوالٹی بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے مختلف سہولتوں اور اسکیموں کا اعلان کیا اور ان کے لیے متعدبہ رقم بجٹ میں مختص کی گئی۔

ان سرکاری اعلانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری عوامی حکومت وقت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور چھوٹی صنعتوں اور کھادی و دیہی صنعتوں کو فروغ دینے سے ملک میں معاشی استحکام اور خوشحالی لانا چاہتی ہے۔

چھوٹی صنعتوں کی قابلِ ذکر پیش رفت کا اثر ہمارے ملک کے ہر دائرے میں نمایاں ہے۔ اس وقت یہ زمرہ پانچ ہزار سے زیادہ مصنوعات تیار کر رہا ہے جو مقدار و تعداد میں اضافے کے ساتھ اچھی کوالٹی اور مسابقتی اعتبار سے ملکی و غیر ملکی بازاروں میں قابلِ قبول ہیں اور ان کی مانگ برابر بڑھتی چلی جارہی ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ مصنوعات کے نام پیش ہیں:

1- زراعت، جنگل کی پیداوار و غذائی اشیا جیسے تیل نکالنا، دال چاول صاف کرنا، جانوروں کا چارہ، مرغیوں کا دانہ بنانا، کولڈ اسٹوریج، ہاتھ سے کاغذ بنانا، اچار چٹنی مربے شربت وغیرہ تیار کرنا، پاپڑ بنانا، شہد کی مکھی، ریشم کے کیڑے پالنا، جڑی بوٹیوں سے دوائیں بنانا۔

2- پلاسٹک، ربر اور کیمیکل مصنوعات، جیسے صابن، دھوپ اگربتی، رنگ وارنش، موم بتی، آیورویدک دوائیں، پلاسٹک کے ڈبے، برتن، پائپ، کھلونے وغیرہ بنانا۔

3- چمڑے کی چیزیں، جوتے چپل، سوٹ کیس، بیگ، تھیلے، دستانے وغیرہ

4- انجینئرنگ کا سامان، آلات، اوزار اور طرح طرح کی مشینیں بنانا۔

5- بجلی اور الیکٹرونکس کی مصنوعات، ریڈیو، لاؤڈ اسپیکر، ٹی وی ریسیور، بلب، لیمپ میٹر۔

6- ہوزری اور ٹکسٹائل سے متعلقہ اشیا، موزے، بنیائن، نواڑ۔

7- لکڑی کا سامان۔

8- مٹی اور معدنیات کی بنی چیزیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں شروع کرنے کے لیے ہر ضلعے میں ریاستی حکومت کے تحت چلنے والے ضلع صنعتی مرکز قائم ہیں جو کام کرنے والوں نیز نئی صنعت لگانے والوں کو ہر قسم کی معلومات اور امداد فراہم کرتے ہیں۔ ٹیکنکل رہنمائی، صنعت کے انتخاب، ٹریننگ اور کوالٹی بہتر کرنے کے لیے حکومتِ ہند کے قائم کردہ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ اور اس کی شاخیں اور ورکشاپ قائم ہیں جہاں چھوٹے صنعت کاروں کو ہر طرح کی عملی مدد دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قومیائے ہوئے بینک، چیمبر آف کامرس، تاجروں اور صنعت کاروں کی انجمنیں، روٹیری کلب اور متعدد رضاکار تنظیمیں اس پروگرام کی ہر ممکن طریقے سے ہمت افزائی اور مدد کرتی ہیں۔

اسی سلسلے میں ملک میں ایک اور اہم اور مفید اسکیم وزیر اعظم کی روزگار یوجنا کے نام سے چل رہی ہے جس سے ہر سال 2 لاکھ بیس ہزار تعلیم یافتہ بے

روزگار افراد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس اسکیم سے کوئی بھی تعلیم یافتہ بے روزگار جس کی عمر 18 اور 35 سال کے درمیان ہو اور جس نے آٹھویں درجے کا امتحان پاس کرلیا ہو اور جس کے کنبے کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار روپے سے زائد نہ ہو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت دو لاکھ روپے تک کا قرض صنعت اور سروسنگ اکائی اور ایک لاکھ کا قرض احیا کے لیے بینکوں کے ذریعے مہیا کرایا جاتا ہے جس پر حکومت 15% سبسڈی، جس کی انتہائی حد 7500 روپے ہے، دیتی ہے۔ یہ قرض مع سود کے 3 سال سے لے کر 7 سال کی مدت تک دیا جاتا ہے اور اس میں کسی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کو اس اسکیم کے تحت قرض دیا جاتا ہے ان کی ٹریننگ کا بھی انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ آٹھویں پلان کے آخری چار سالوں میں دس لاکھ سے زائد تعلیم یافتہ بے روزگاروں نے اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا اور یہ اسکیم نویں پنج سالہ منصوبے میں بھی جاری ہے۔

اس طرح ملک کے طول و عرض میں چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے، ان کی کارکردگی اور پھیلاوے کو بڑھانے کی منظم کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کا نتیجہ بھی ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش بدستور جاری ہے اور جاری رہے گی جب تک کہ بابائے قوم گاندھی جی کے ارشاد کے مطابق قطار کے آخری آدمی کی ضرورتیں پوری نہیں ہو جاتیں!!

□□□

Zahida Manzil, 4/873,
New Friends Colony, Aligarh-202002

تحریک خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریک خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46 روپے

بابر نامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

"تزک بابری" کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35 روپے

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلیٰ درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ کے لیے خصوصی رعایت

پتا: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ڈی. مادھون نائر

خلائی تحقیقات میں ترقی

اکیسویں صدی میں خلائی ٹیکنالوجی میں کیا ترقی ہوگی اس کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ 1950 کی دہائی میں آرتھر سی کلارک اور دیگر سائنسدانوں کا جو خواب تھا وہ آج حقیقت بن چکا ہے۔ جو لوگ اب آئندہ کے بارے میں خواب دیکھ رہے ہیں شاید وہ بتا سکیں کہ اکیسویں صدی میں کیا ہوگا۔ لیکن خلائی تحقیق کے شعبے میں کیا کیا ترقی ہوگی اس کے بارے میں ہم صرف آئندہ دس یا بیس برس تک کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تاریخ انسانیت کے اوائل سے ہی انسان میں یہ خواہش رہی ہے کہ وہ کائنات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرے اور اس کے سربستہ رازوں سے واقف ہو جائے۔ ایک طرف تو ہم نے کائنات کی انتہائی چھوٹی چیزوں جیسے ایٹم، پروٹون، نیوٹرون اور حتیٰ کہ ایٹم کے بھی ٹکڑوں کے بارے میں آگہی حاصل کی تو دوسری طرف ہم نے خلا، ستاروں اور دیگر کہکشاؤں کے بارے میں یعنی کائنات کی بڑی چیزوں کے بارے میں تحقیق شروع کردی۔ ان دونوں ہی شعبوں میں آج ہندستان ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔

بیرونی خلا کے بارے میں قابل قدر تحقیقات پچھلی نصف صدی میں شروع ہوئیں۔ پچاس کی دہائی کے اوائل میں سوویت یونین اور امریکہ نے اس شعبے میں کافی مسابقتی انداز میں کام کیا اور سوویت یونین نے Sputnik نام کا سیارچہ پہلی مرتبہ بیرونی خلا میں پہنچا کر ایک نیا باب کھولا۔ اس کے بعد زبردست تحقیقاتی سرگرمیاں شروع ہوئیں کہ بیرونی خلا کو کس طرح فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امریکہ نے پہلی مرتبہ چاند پر انسان کو اُتار کر اس شعبے کی تحقیقات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ہندستان میں اس سلسلے کی تحقیقات 1963 میں ڈاکٹر وکرم سارابھائی کی قیادت میں شروع ہوئیں۔ اس وقت جبکہ یہ تحقیقات شروع کی گئیں اس بات کا بھی دھیان رکھا گیا کہ خلائی تحقیق کو کس طرح ایک عام انسان کے فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پہلا راکٹ جو ہندستان نے داغا وہ Thumpa کے تحقیقاتی مرکز سے چھوڑا گیا تھا اور وہ 110 کلومیٹر کی اونچائی تک گیا۔ اس سے سوڈیم کے بخارات خارج ہوئے اور اس سوڈیم کے بخارات کے تجربات سے ہم نے بہت سی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جیسے خلائے بسیط میں ہواؤں کا رُخ، کرۂ ارض کے بیرون میں برقی لہروں سے متعلق اعداد و شمار اور استوائی الیکٹروجیٹ وغیرہ کے بارے میں حقائق۔ اس تحقیق نے جو بہت چھوٹے پیمانے پر شروع کی گئی تھی آج ہمیں دنیا کے گنے چنے ملکوں میں شامل کر دیا ہے۔ آج ہم نے خلائی تحقیق میں مواصلات اور ریموٹ سینسنگ (remote-sensing) سے متعلق پروجیکٹ مکمل کر لیے ہیں اور اب اس سیارچے کے ذریعے جو 6 ہزار کلومیٹر کی اونچائی پر کرۂ ارض کے گرد چکر لگا رہا ہے ہم دنیا کے کسی بھی حصے پر الیکٹرومیگنیٹ سگنل بھیج سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے مواصلات کا نظام اور ریڈیو یا ٹیلی ویژن کا استعمال بھی ممکن ہو سکا ہے۔ اس مقصد کے لیے Insat سلسلے کے Geo-Static سیارچے تیار کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ برصغیر ہند پر بادلوں کی جسامت یا سائز اور اُن کی حرکت کے بارے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور ان اطلاعات کی بنیاد پر سمندری طوفان کے مرکز، اس کے بڑھنے کی سمت اور اس کی لپیٹ میں آنے والے علاقوں وغیرہ کے بارے میں پیش گوئی کرنا اب ممکن ہے۔ حال ہی میں اُڑیسہ میں جو سمندری طوفان آیا تھا اس کے بارے میں بھی وقت سے بہت پہلے پیش گوئی کرنا ممکن ہو سکا تھا لیکن چونکہ اس طوفان سے بہت بڑا علاقہ متاثر ہوا تھا اس وجہ سے اس کا سدِّباب کرنا ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ اسی وجہ سے اتنا زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس طرح کی تباہی کے واقعات ماضی میں بھی ہو چکے ہیں۔ ان دنوں لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان واقعات کے رونما ہونے سے پہلے ان کی اطلاع پا سکتے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ سمندری طوفان رات کے وقت آتا جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے اور اس طرح سے ہزاروں افراد کی جانیں ضائع ہوتیں۔ لیکن اب ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج جانی و مالی نقصان بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے کیونکہ سمندری طوفان کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ بہر حال اب ہمارے لیے یہ ممکن ہو چکا ہے کہ سیارچوں کے ذریعے حاصل کی گئی تصاویر کی بنیاد پر ہم قدرتی آفات کا پہلے سے پتا چلا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری اقدامات محکمۂ موسمیات، ریاستی سرکار اور خلائی تحقیق کے محکمے کو مشترکہ طور پر اُٹھانے چاہئیں۔ آنے والے برسوں میں ہمارے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اس شعبے میں ہم قابل قدر ترقی حاصل کر سکیں۔

ہماری تحقیقات کا دوسرا شعبہ ریموٹ سینسنگ (Remote Sensing) ہے۔ کرۂ ارض کے اوپر یعنی زمین سے تقریباً 500 سے ایک

ہزار کلومیٹر اونچائی پر گردش کرتے ہوئے سیارچے کے ذریعے زمین (یا دنیا) کی بہت صاف تصویریں اُتارنا ممکن ہے۔ یہ تصاویر Multi Spectral Bands میں لی جاتی ہیں۔ اس طرح ہم زراعت، جنگلات، آبی ذرائع اور برف پگھلنے وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ پچھلے دس سے پندرہ برسوں کے بیچ لی گئی اس طرح کی تصاویر سے حاصل کی گئی اطلاعات کو قومی منصوبہ بندی کے مقاصد میں استعمال کیا جارہا ہے۔ زراعت میں فصل کاٹنے سے تین ماہ پہلے سیارچوں کے ذریعے لی گئی تصاویر سے یہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہے کہ پیداوار کتنی ہوگی اور آیا کسی جگہ فصلوں میں کیڑے وغیرہ کی بیماری تو نہیں پھیلی ہوئی ہے۔ ان اطلاعات کو غذائی اجناس کی حصولی اور اس کے مطابق منصوبہ بندی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس طریقے سے جنگلاتی ذرائع کے بارے میں حقائق کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ 1995 میں کل جنگلات 19.5 فیصد تھے جبکہ اس سال جنگلاتی علاقہ گھٹ کر 15 فیصد رہ گیا ہے۔ تقریباً 5 ہزار ہیکٹیر علاقے سے جنگلات کاٹ دیے گئے ہیں۔ ان اطلاعات سے محکمہ جنگلات فیض حاصل کرسکتا ہے اور منصوبہ بندی کمیشن مستقبل میں جنگلات کاٹنے کو روکنے کے لیے اس کا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

ماہی گیری میں بھی اسی طرح کی تحقیقات کی جارہی ہیں۔ حال ہی میں مدار میں چھوڑے گئے سیارچے PSLV کے ذریعے سمندر کے پانی کے رنگ اور درجہ حرارت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح کی اطلاعات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں کہ سمندر کے کس حصے میں مچھلیوں کی تعداد زیادہ ہے اور کس حصے میں مچھلیوں کا چارہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر ماہی گیری کشتیوں کو ان علاقوں میں بھیجا جاسکتا ہے جہاں مچھلیاں بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ آندھرا پردیش اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں اس طرح کے تجربات تقریباً 20 سال سے کیے جارہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ماہی گیری کی کشتیوں سے پکڑی گئی مچھلیوں کی مقدار کو دوگنا کرنا ممکن ہے۔

اس طرح مواصلات اور ریموٹ سینسنگ کے شعبے میں یہ ممکن ہے کہ اس طرح کے مختلف منصوبے شروع کیے جائیں جو عوام کے لیے فائدہ مند ہوں۔ اس سلسلے میں سیارچے بنانے، اس مقصد کے لیے الیکٹرانک ساز و سامان کے ڈیزائن تیار کرنے اور انھیں بنانے اور حاصل شدہ اعداد و شمار کو قابلِ استعمال بنانے، اُن کو ان محکموں تک پہنچانے میں جو اِن اعداد و شمار کو استعمال کرتے ہیں اور ان سب کے علاوہ زمین سے تمام سیارچوں کو خلا میں پہنچانے اور خاص طور پر ان کو مناسب مدار میں نصب کرنے میں ISRO نے اپنے پروجیکٹوں کی بنیاد پر بہت کامیابی حاصل کی ہے۔

ہم 1500 کلوگرام وزن تک کے سیارچے کو خود اپنے PSLV راکٹ کے ذریعے مدار میں پہنچانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مواصلات کے مقصد کے لیے 3.5 ٹن وزن کے سیارچوں کو بیرونی مدار میں پہنچانا بھی ممکن ہوچکا ہے Geosynchronous سیارچوں کو مدار میں پہنچانے کے لیے Launching Vehicles یعنی مدار میں پہنچانے والے راکٹ آئندہ ایک سال میں ہندستان میں ہی بنائے جاسکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اس سلسلے میں تمام مرحلوں کے لیے یعنی سیارچے تیار کرنے، ان کو مدار میں پہنچانے، ان کو ہم مدار میں نصب کرنے، ان سے ضروری اعداد و شمار حاصل کرنے اور ان کو قابلِ استعمال بنانے میں کافی ترقی حاصل کرلی ہے۔

دوسرے مرحلے میں ایک یا دو مزید شعبوں میں بھی فروغ حاصل ہوگا۔ ہم قدرتی آفات کے انتظام سے متعلق تمام ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت حاصل کرچکے ہیں۔ سیارچوں کے ذریعے تعلیم کے مقصد سے ٹیلی ویژن کا جامع استعمال بھی ہوگا۔ اگر اسکولوں کی کلاسوں میں ٹیلی ویژن فراہم کردیے جائیں اور ان پر تعلیمی پروگرام دکھائے جائیں تو ان طلبہ کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوگا جو دور دراز کے علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس طرح کے تجربات کیے جاچکے ہیں کہ کس طرح اسکولوں کی کلاسوں کو مفید بنایا جاسکتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے جابا گاؤں کے ناخواندہ لوگوں کے فائدے کے لیے بڑے قصبوں کے اسٹوڈیوز میں کلاسیں لگائی گئیں اور انھیں پروگرام دکھائے گئے۔ تقریباً ایک سو جگہ اس طرح کی کلاسیں لگائی گئیں جہاں گاؤں والوں کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کا جواب فوری طور پر ٹیلی ویژن کے ذریعے دکھایا گیا۔ اس طرح کی کلاسیں صفائی، زراعت اور خواندگی کے موضوعات پر منعقد کی گئیں اور گاؤں والوں کی طرف سے ظاہر کیے گئے شکوک و شبہات کو فوری طور پر اسی وقت ٹیلی ویژن کے ذریعے دور کردیا گیا۔ اگر اس طرح کی کلاسیں قومی سطح پر دور دراز کے تمام گاؤں میں منعقد کی جائیں تو تعلیم کا یہ ایک بہترین طریقہ کار ہوگا۔

ایک دوسرا شعبہ Tele-Medicine یعنی ٹیلی ویژن کے ذریعے علاج کا شعبہ ہے۔ ہمارے تمام بڑے بڑے اسپتال اور ماہر ڈاکٹر شہری علاقوں میں موجود ہیں۔ جبکہ گاؤں میں رہنے والے مریض ان جگہوں تک نہیں پہنچ پاتے اور طبی ماہرین گاؤں میں نہیں جاتے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے مقصد سے ایسے تجربات کیے گئے ہیں جس میں شہروں کے ڈاکٹروں اور گاؤں کے مریضوں کو ٹیلی ویژن کے ذریعے آمنے سامنے لایا گیا۔ اس طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے وہ تمام سہولیات بھی مہیا کی جاسکتی ہیں جو ڈاکٹر کو مریضوں کو دیکھنے اور ان کے علاج کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس طرح دور دراز کے مریض بھی شہروں میں رہنے والے ماہر ڈاکٹروں سے صلاح لے سکتے ہیں۔

عالمی سطح پر خلا میں تجرباتی اسٹیشن قایم کیے گئے ہیں۔ روس پچھلے دس بارہ برس سے خلائی اسٹیشن میر (MIR) کا استعمال کر رہا تھا جو مدار میں گردش کر رہا تھا۔ سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد ان اسٹیشنوں پر جاکر وہاں تجربات کر چکی ہے۔ بہت سے ایسے تجربات ہوئے ہیں جو ماحول میں صفر قوت کشش میں کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ اور تجربات مختلف قسم کے کیمیا بنانے، کرسٹل بنانے اور جیومیٹری کی اشکال بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اب MIR اسٹیشن کی کارکردگی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد الفا (ALFA) خلائی اسٹیشن بنانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ یہ تمام امریکہ اور یورپ مشترکہ طور پر انجام دے رہے ہیں۔ یہ اسٹیشن ایک یا دو سال میں پوری طرح کام کرنے لگے گا۔ یہ اسٹیشن اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ وہ انسانوں کے قیام کے لیے موزوں ہوں۔ اس گاڑی کو باری باری گردش دی جائے گی اور اس میں تھوڑی سی قوت کشش بھی ہوگی۔ اس میں دیگر سہولیات جو زندگی کے لیے ضروری ہیں جیسے آکسیجن، پانی اور غذائی سپلائی بھی موجود ہوگی۔ سائنسداں اس میں ایک سال تک رہ بھی سکتے ہیں اور جب اس طرح کے اسٹیشن زیادہ ہو جائیں گے تو نہ صرف سائنسداں بلکہ عام آدمی بھی ان اسٹیشنوں پر جا سکیں گے اور اس طرح خلائی سیاحت مستقبل قریب میں ایک حقیقت بن جائے گی۔ اس طرح کے سیاح بھی ہوں گے جو خلا میں چند روز گزارنے کے بعد واپس آ جائیں۔ خلائی اسٹیشنوں سے ستاروں اور دیگر کہکشاؤں کی تحقیق و مطالعے میں زیادہ آسانی ہوگی کیونکہ زمین کی بہ نسبت انھیں خلا سے زیادہ صاف اور روشن دیکھا جا سکتا ہے۔ چندرا خلائی تجربہ گاہ جسے خلائی شٹل کے ذریعے مدار میں پہنچایا گیا ہے، اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے۔ اس سے ایکس رے شعاعوں کی تابکاری اور انفرا ریڈ شعاعوں کی تابکاری کو نہایت درست طریقے سے ریکارڈ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ ہم ہندستانی سیارچوں کو ایکس ریز اور گاما ریز کے ذریعے اشارے بھیجنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس صدی میں جس ایک اور شعبے میں ترقی حاصل کی جا سکتی ہے وہ ہے خلائی کان کنی۔ یعنی ہم بیرونی خلا میں دوسرے سیاروں میں جاکر وہاں پائے جانے والے معدنیات اور گیس اکٹھا کر کے لا سکتے ہیں اور انھیں اپنی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم بیرونی خلا میں تحقیقات اور ترقی سے اس طرح کے بہت سے امکانات کو حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

موجودہ حالات میں ایک کلوگرام وزن کو زمین کے گرد مدار میں پہنچانے کے لیے تقریباً دس لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی خطیر رقم کے اخراجات کی وجہ سے چھوٹے ممالک اس طرح کے منصوبوں پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے سیارچوں کو خلا میں بھیجنے کے اخراجات میں کمی ہونی ہی چاہیے۔ آج راکٹ میں کام آنے والا ایندھن یعنی آکسیجن وغیرہ کا وزن بھی راکٹ میں ہی شامل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے راکٹ داغنے کے اخراجات اسی مناسبت سے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک PSLV جب زمین سے داغا جاتا ہے تو اس وقت اس کا وزن 290 ٹن ہوتا ہے لیکن جب یہ اپنے مدار میں پہنچتا ہے تو اس کا وزن صرف ڈیڑھ ٹن رہ جاتا ہے۔ باقی تمام وزن یا تو ایندھن کے طور پر جلنے میں کام آ جاتا ہے یا بیرونی خلا میں چھوٹ جاتا ہے۔ اگر فضا میں موجود آکسیجن کو راکٹ میں استعمال کیا جا سکے تو پھر راکٹ داغنے کے اخراجات میں کافی حد تک کمی ہو سکتی ہے۔ ہوائی جہازوں میں ایندھن کے طور پر جلنے والی آکسیجن وہی ہوتی ہے جو فضا میں موجود ہوتی ہے لیکن اس طرح کے انجن استعمال کر کے راکٹ کی رفتار آواز کی رفتار سے صرف ڈھائی گنا ہی حاصل کی جا سکتی ہے جبکہ راکٹ کو آواز کی رفتار سے 25 گنا زیادہ رفتار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر راکٹ بھی ہوائی جہازوں کی طرح کام کرنے لگیں اور ان کی رفتار آواز کی رفتار سے 10 گنا تک حاصل کی جا سکے تو پھر ایک عام راکٹ کو بھی دوسرے مرحلے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دونوں مرحلوں کے آخر میں راکٹ خود بخود آواز کی رفتار سے 25 گنا رفتار حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ہم ایسا راکٹ بنا سکیں جو ہوائی جہاز کی طرح کام کرے، رن وے پر یعنی ہوائی پٹی سے اڑان بھرے اور خلا میں پہنچے اور اپنا کام کرے اور پھر واپس زمین پر لوٹ آئے، اسی طرح جس طرح ایک ہوائی جہاز واپس پہنچ جاتا ہے تو اس طرح کے راکٹ کو متعدد بار استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو یہ ایک ہی Launching کو سینکڑوں بار استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ایک ہی Launching Vehicle یعنی داغنے والی گاڑی کو دس مرتبہ استعمال کیا جا سکے تو راکٹ کو خلا میں بھیجنے کے اخراجات میں پانچویں حصے تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن مستقبل کے نیے خلائی گاڑیاں ہم اسی وقت بنا سکتے ہیں جب ہم مختلف شعبوں میں جیسے فضا میں سانس لینے کی ٹیکنالوجی، دوبارہ استعمال ہونے والے Launching Vehicles، جہازوں کی آمد و رفت اور کنٹرول نظام میں قابل ذکر ترقی حاصل کر سکیں۔ ترقی یافتہ ممالک اس طرح کے تجربات میں مصروف ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ دس برسوں میں یہ ممکن ہو جائے گا۔ ہمارے لیے 2020 تک یہ ناممکن نہیں رہے گا کہ ہم دو مرحلوں والا خلائی جہاز بنا لیں جو مدار میں پہنچنے کے بعد پھر واپس آ سکے گا۔

ہم نے جو اب تک تذکرہ کیا وہ سیارچوں کو مدار میں پہنچانے کے بارے میں تھا۔ لیکن ان سیارچوں میں انسان کے قیام کے لیے ضروری

سہولیات کے سلسلے میں بھی ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ انسان سیارچوں پر صرف اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب کہ High Vacuum، تابکاری، شہاب ثاقبوں کے گرنے اور ذرات کی تابکاری جیسے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ ہمیں اس کے لیے ایسا خلائی اسٹیشن بنانا ہوگا جو ان منفی اثرات سے محفوظ ہو۔ جب انسان صفر ڈگری قوت کشش کی فضا میں رہتا ہے تو اس کے اعضا خراب ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے بھی ادویات کے شعبے کو فروغ دینا ہوگا۔ سیارچوں کے ذریعے لی گئی زمین کی تصاویر میں پانچ میٹر کے فاصلے پر ہی زمین میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ آنے والے برسوں میں اس کو ایک یا ڈیڑھ میٹر کرنا ہوگا۔ اس کے لیے موزوں سینسر بنانے ہوں گے۔ اس طریقے سے حاصل کی گئی معلومات کا تجزیہ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اسے جامع طور پر زمین پر کیسے بھیجا جا سکتا ہے، اس پر تحقیق کرنا ہوگی۔ اس کا مطلب یہ کہ اعداد و شمار یکجا کرنے کی ٹیکنالوجی کو بھی مزید فروغ دینا ہوگا اور اس کی مناسبت سے سیارچوں میں تجرباتی ساز و سامان بھی زیادہ لے جانا ہوگا۔ اسی وجہ سے ان کو چلانے کے لیے بھی مزید توانائی کی ضرورت ہوگی۔ اس مقصد کے لیے سورج کی گرمی سے چلنے والے سیلوں کی صلاحیت کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے؟ ہمارے سورج کی گرمی سے چلنے والے سیل یعنی Solar cells کی صلاحیت 10 سے 15 فیصد تک ہوتی ہے۔ اس کو 20 سے 25 فیصدی تک بڑھانا ہوگا۔ اس لیے جب ہم خلائی تحقیق کی بات کرتے ہیں تو اس میں ہمیں خلائی جہاز، خلا میں سیارچے پہنچانے والی گاڑی، خلا میں پہنچانے سے متعلق نظام اور اس سے متعلق ٹیکنالوجی جیسے بہت سے شعبوں میں چیلنجوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ دیگر ممالک نے نصف صدی کے عرصے میں اس سلسلے میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ جبکہ ہم صرف 30 برس کے عرصے میں اپنی کوششوں سے دنیا کے دیگر ممالک کے مقابل کھڑے ہو گئے ہیں۔ اب اگر ہمیں اپنی ترقی کی اس رفتار کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں اس شعبے سے متعلق سائنس و ٹیکنالوجی کے سینکڑوں پہلوؤں میں ترقی کرنی ہوگی۔ ہم نے اپنے اس جذبے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ دو وجوہات کی بنا پر کیا ہے۔ اوّل یہ کہ ہم یہ ٹیکنالوجی کسی قیمت پر باہر سے حاصل نہیں کر سکتے اور دوسری بات یہ کہ ہم دنیا کے ملکوں کے درمیان احترام کی نظر سے اسی وقت دیکھے جا سکتے ہیں جب ہم ٹیکنالوجی کے میدان میں مستحکم ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر شعبے میں خود انحصاری و خود کفالت کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

(مترجم: سید ظفر حسن)

قومی اردو کونسل کا مثبت قدم

مکرمی!

میرٹھ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو مطبوعات کو جس خوب صورت انداز سے موبائل موٹر میں سجا کر مغربی اتر پردیش کے مختلف شہروں میں مقیم اردو زبان کے شیدائیوں کی خدمت میں پیش کیا ہے وہ مثالی اور تاریخی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل نے ہر قسم کی کتابیں مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لغات، مذہب، فلسفہ، کتب خانہ، تعلیم، نفسیات، سماجیات، اخلاقیات، معاشیات، تجارت و سائنس، ٹکنالوجی، بچوں کا ادب اور طب معالج وغیرہ موضوعات پر ایسی قدیم و جدید کتابیں رکھیں جن کا پتہ لوگوں کو نہ تھا اور انھیں طبع ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا مگر خریدار کی نظر سے یہ کتابیں محروم تھیں۔ دیگر شہروں کی تو میں کہتا نہیں مگر اپنے میرٹھ میں میں نے دیکھا کہ موبائل گاڑی شہر کے مختلف مقامات پر جا کر کھڑی ہوئی نہیں کہ طالبانِ اردو اپنی ضرورت کی کتابیں خریدنے کے لیے وہاں جمع ہو گئے اور اپنے موضوع اور شوق کی مناسبت سے کتابیں خریدیں۔ ان کتابوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی مختلف لوگوں کے مزاج، شوق، موڈ اور موضوع سے حد درجہ مناسبت رکھتی ہیں اور اگر انھیں اس طرح عام پبلسٹی نہ دی جاتی تو وہ سرکاری مال خانے میں دیمک کی نذر ہو جاتیں یا غیر اردو داں لوگ ان جواہرات کو ردی سمجھ کر تلف کر ڈالتے۔ سنا ہے میرٹھ میں اسی کامیاب مہم سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ کی کتابیں لوگوں نے خریدیں تو مغربی اتر پردیش کے دیگر شہروں میں تو قریب قریب اتنی ہی یا اس سے زیادہ کتابوں کی خریدی ہوئی ہوگی۔ یہ کام اردو کے حق میں بہت نیک اور منفعت بخش ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح کی اجتہادی مساعی بروئے کار لائی جاتی رہیں اور یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ اردو داں حضرات اردو کتابیں نہیں خریدتے۔

سید اختر الاسلام

158، شاہ تھن، میرٹھ

(بہ شکریہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انجم کمار

برن آؤٹ سنڈروم

مسلسل بڑھتے ہوئے سماجی مسائل، مادیت کا روز افزوں اثر، معاشرتی منظرنامے میں آرہی تبدیلی اور زبردست مقابلہ آرائی کے دور میں آج انسان ہر طرح کے ذہنی دباؤں سے گھرا ہوا ہے۔ جلد از جلد اپنی اتاپ شناپ آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے جوش میں وہ اپنے آرام و آسائش اور سکون و اطمینان کو بالکل تج دیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ جسمانی اور ذہنی تکان سے چور ہو جاتا ہے۔ یہی آج کے بڑے شہروں کی طرز زندگی ہے۔ انتہائی اہم ذمے داریوں سے منسلک حضرات، انسانیت کی خدمت کے لیے وقف افراد اور پابند اوقات پیشہ ور ایسی صورت حال کے سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے کاموں کو مکمل سپردگی اور صلاحیت کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اپنے راحت و آرام کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کوئی بھی کام ہو وہ ''نہ'' نہیں کہہ پاتے، اپنی نجی زندگی کی بھی پروا نہیں کرتے اور ذمے داری پر ذمے داری لیتے چلے جاتے ہیں، گھر پر بھی انھیں دفتر کی ذمے داریوں کی فکر لگی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ''برن آؤٹ سنڈروم'' کی گرفت میں آجاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں ضائع ہونے لگتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کثیر المقاصد پیشہ ور جو زیادہ کام کر کے اپنی اونچی خواہشات پوری کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جلد ہی برن آؤٹ سے متاثر ہو کر دماغی امراض کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ہماری دماغی صحت بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی جسمانی۔

دراصل برن آؤٹ سنڈروم (Burn-out Syndrome) کوئی طبی اصطلاح نہیں ہے، پچھلے کچھ ہی برسوں سے اس کا رواج ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جس میں انسان جسمانی، جذباتی اور ذہنی تکان محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک داخلی نفسیاتی احساس ہے، جسمانی علامتوں میں تکان سے قلت توانائی، انتہائی کمزوری، بے خوابی، بدن ٹوٹنا، بیمار ہونے کے امکانات، برابر سر درد، متلیاں، کمر درد اور دیگر جسمانی علامتوں کا احساس ہوتا ہے۔ جذباتی طور سے تکان کی علامتوں میں قوت برداشت کی کمی، مایوسی، تناؤ میں اضافہ، بلاوجہ غصہ، چڑچڑاپن اور صبر میں اچانک کمی وغیرہ۔ کچھ دیگر علامات بھی ہیں جیسے دوستی میں کمی، نرمی میں کمی اور کسی عزیز کے تئیں لاپروائی وغیرہ، ذہنی تکان سے بے اطمینانی، کسی شخص، کام، زندگی یا خود اپنے تئیں ناامیدی اور لاپروائی کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ اس سے آدمی کو زندگی میں متعدد قسم کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عہد جدید کی مصروف زندگی، بڑی بڑی خواہشات و توقعات اور کم وقت میں زیادہ مقاصد اور زیادہ نشانوں کے حصول کی دھن میں جب ناکامیوں کی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں، یا پھر جب کچھ لوگ اپنے آپ کو غیر معمولی سمجھ کر کئی اہم کاموں کو تھوڑے وقت میں پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ناکام ہو جاتے ہیں تب وہ چڑچڑے ہو کر خود پر ہی جھنجھلانے لگتے ہیں۔ جس طرح دو کشتیوں میں سوار ہونے پر ندی پار کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح دو اہم کام ایک ساتھ کرنے پر کام کی صلاحیت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص زندگی میں کسی اونچے مقام پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے بالائی منزل پر پہنچنے کے لیے کئی کئی زینے چڑھ کر جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح اسے بڑے نشانے کے حصول کے لیے چھوٹے چھوٹے نشانے متعین کر کے آگے بڑھنا چاہیے تاکہ اپنی منزل تک بہ آسانی پہنچ سکے، یہی ماہرین کی بھی رائے ہے۔ لیکن اب ہر شخص ''شارٹ کٹ'' کا راستہ اپنانا چاہتا ہے، اطمینان اور صبر سے کام لینا بہت کم لوگوں کے بس کا روگ رہ گیا ہے۔ چناں چہ ایسے ہی حالات متعدد ذہنی مسائل کو جنم دیتے ہیں جن میں ایک ''برن آؤٹ سنڈروم'' بھی ہے۔

برن آؤٹ سنڈروم اور اس کی ابتدائی علامات کے بارے میں ماہر نفسیات محترمہ وندنا بتاتی ہیں کہ ابتدا میں چڑچڑاپن، بلاوجہ غصہ آنا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول دے کر انھیں بڑا مسئلہ بنا کر لڑنا، فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں کمی، فکر مند رہنا اور ذہنی اور جسمانی تکان محسوس کرنا اس کے اشارے ہیں۔ کسی کشمکش اور تذبذب کے موقع پر ایسے لوگوں میں تخلیقی افکار (Creative Ideas) کی کمی ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی جسمانی و ذہنی صلاحیتیں ضائع ہونے لگتی ہیں۔ انھیں مایوسیوں کے ہاتھ لگنے سے خود میں ''برن آؤٹ'' کی علامتیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق برن آؤٹ ایک دن کے کام کے بوجھ یا خواہشات کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ کسی شخص میں دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے اور ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ یہ کافی سنگین ہو جاتا ہے۔ اس وقت آدمی اپنی پوری صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں کر پاتا، ابتدائی مراحل میں آدمی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ برن

آؤٹ کی طرف بڑھ رہا ہے، حالاں کہ وہ اپنے برتاؤ میں آئی تبدیلیوں کو محسوس ضرور کرتا ہے۔ عموماً آدمی اپنی انانیت کی وجہ سے بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرپاتا کہ وہ اس مسئلے سے دوچار ہے، وہ اکثر حالات اور دیگر اشخاص کو اس کا مورد الزام ٹھہرادیتا ہے۔

اپنے دائرۂ کار میں مکمل طور سے غرق افراد میں اس کے بہت ہی زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو سب سے لائق وفائق اور دیگر افراد سے منفرد سمجھنے والے بھی انانیت کی وجہ سے اس کا اس وقت شکار ہونے لگتے ہیں جب انھیں زندگی یا میدانِ عمل میں کہیں بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

زیادہ وقت تک کام کرنے والے افراد میں یہ مسئلہ ان کو جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے انھیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں اور وہ کسی اہم مسئلے پر فیصلہ نہیں لے پارہے ہیں۔ تب اپنی صلاحیتوں کے بارے میں ان کے غلط تصورات قائم ہونے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں باہمی تعلقات بھی خراب ہونے لگتے ہیں، قریبی رشتوں میں دوریاں بڑھنے لگتی ہیں، سماج اور اپنوں سے لاتعلقی یا غفلت کا جذبہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ ان سب باتوں سے خاندانی روابط فطری طور پر متاثر ہونے لگتے ہیں۔

کام کا دباؤ، مادی خواہشات، سماجی، اقتصادی اور سیاسی عوامل بھی برن کو جنم دیتے ہیں، جیسے خدمتِ خلق کے لیے سرکاری امداد میں کمی، اس کام کے لیے وقف اداروں کے دائرۂ کار میں حد بندی یا دخل اندازی اور ملازمین کی تعداد میں چھٹنی وغیرہ جس کی وجہ سے ان پر ذہنی دباؤ اور کام کا بوجھ بڑھتا ہے۔ کئی ملکوں میں مشاہرے یا کام کی قلت اور دیگر معاشی اسباب اس کے ذمّے دار ہوتے ہیں۔ تہذیبی اور سماجی عوامل کے ضمن میں عزت کی کمی، سماجی تناظر میں زبردست مقابلہ آرائی، سماجی، خاندانی اور نسلی امتیاز، کام کے تئیں بے اطمینانی وغیرہ۔ اس مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے ڈاکٹر وندنا کہتی ہیں کہ ہمارا دماغ بھی ایک حیاتیاتی عضو ہے جسے ہمارے جسم کے ساتھ آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ذمّے دار عہدوں پر مسلسل کام کرنے کے دوران کبھی کبھی اپنے سکون کے لیے وقت نکالنا ضروری ہو جاتا ہے، کام کی فکر سے اپنے آپ کو بالکل آزاد کر کے لطف اٹھانا چاہیے اور ایسے وقت میں خاندان اور دوستوں سے کام کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔

برن آؤٹ کی جانچ کے لیے ایک .M.B.I ٹیسٹ کیا جاتا ہے، جس میں کچھ سوالوں کی مدد سے آدمی کے دماغ پر برن آؤٹ کی سطح کے بارے میں معلوم کیا جاتا ہے۔ اعداد و شمار کے اعتبار سے بڑے شہروں میں اس کے شکار لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ برن آؤٹ اور ڈپریشن (Depression) میں فرق یہ ہے کہ ڈپریشن کسی حادثے کا فوری ردِ عمل ہوتا ہے جس میں تکلیف اور مایوسی اصل وجہ ہوتی ہے، جب کہ برن آؤٹ میں یہ وجہ نہیں ہوتی ہے بلکہ کسی طرح کی محرومی اور شکست (Frustration) اس کی اصل وجہ ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر برن آؤٹ بنیادی طور سے دائرۂ عمل کے دباؤ سے متعلق ہوتا ہے، جب کہ ڈپریشن کسی ذاتی تکلیف دہ حادثے پر جذباتی ردِ عمل ہوتا ہے۔

عہدِ حاضر میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ماہر نفسیات ڈاکٹر وندنا بتاتی ہیں کہ گاؤں سے شہروں کی طرف نوجوان طبقے کی ہجرت، سنگل فیملی کا رواج، محدود وسائل اور دائرۂ کار کے بڑھتے ہوئے دباؤ اس کے چند عوامل ہیں۔ مشترکہ خاندان میں کسی دباؤ، تناؤ اور پریشانی کی حالت میں خاندان کے بزرگوں کا جذباتی تعاون ملتا ہے، یہ تعاون آدمی کے تناؤ بھرے حالات میں ''شاک ابزوربر'' کا کام کرتا ہے، جس کے نتیجے میں آدمی کچھ تبدیلی اور راحت محسوس کرتا ہے اور اسے تناؤ سے نجات مل جاتی ہے۔

برن آؤٹ سنڈروم سے بچنے کی کچھ موثر تدبیریں درج ذیل ہیں:

- اپنے کام کی رفتار دھیمی کریں۔ غیر ضروری کاموں کو ٹالنے کی عادت ڈالیں۔ اپنے کاموں کی کیفیت پر توجہ دیں نہ کہ کمیت پر۔ ایک کام مکمل ہونے کے بعد ہی دوسرے اہم کام کی ذمّے داری لیں۔
- اپنی روزمرہ کی زندگی کو منصوبہ بند اور منظم بنائیں۔ اگر بہت ہی زیادہ مصروف ہیں تو اپنی معمول کی زندگی میں تبدیلی لائیں۔ ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ صبح سویرے اٹھیں۔ ضروری ہو تو مکمل آرام کریں۔ کیوں کہ معمول میں لائی گئی تبدیلی زندگی کو حسین اور پُربہار بناسکتی ہے۔
- زیادہ تر مصروف افراد اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے اپنی نیند کے اوقات میں کٹوتی کرتے ہیں جس کی قیمت شاید ان کی خواہشات سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس لیے پوری نیند سوئیں۔ کم سونے سے نہ صرف آپ کی جسمانی طاقت متاثر ہوتی ہے بلکہ اس سے آپ کی ذہنی اور فکری قوت و صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔
- اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے دوسروں کا تعاون لینے میں تردد نہ کریں، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کچھ کام دوسروں کو سونپ دیں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ کچھ لوگ محض آپ کے کہنے پر آپ کا مکمل تعاون کرسکتے ہیں۔
- معمول میں تبدیلی لاکر دماغی تکان دور کرنے کے لیے سیر و تفریح کو

جائیں، سرسبز و شاداب جگہوں میں گھومنے پر بھی ذہنی تناؤ دور ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے کاموں سے جسمانی و ذہنی طور سے بالکل آزاد رہیں۔ مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوں، دل کہے تو لانگ ڈرائیو پر جائیں یا پھر سو جائیں۔

● اپنے کھانے پینے پر ضرور توجہ دیں، جب بھی آپ تکان محسوس کریں گے تو آپ کے جسم اور دماغ کو زیادہ توانائی اور نشو و نما دینے والے عناصر کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا متوازن اور مکمل غذا لیں، چاہیں تو چائے یا کافی لیں۔

● خوب ورزش کریں، اگر آپ ذہنی تناؤ محسوس کر رہے ہیں تو جسمانی ورزش کریں، جیسے جاگنگ، تیزی سے چلنا، سائکل چلانا یا تیرنا۔ ممکن ہے آپ اس سے تھک جائیں جسمانی طور سے، لیکن دماغی اعتبار سے آپ خود کو تر و تازہ اور ہشاش بشاش محسوس کریں گے۔

● عبادت، ریاضت، مراقبہ اور ذکر الٰہی قلب و دماغ کو آرام دینے میں کافی فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تناؤ دور ہوتا ہے بلکہ قلب کی صفائی اور تزکیۂ نفس بھی ہوتا ہے۔

● اپنے حالات کو سدھاریں، زندگی کو متوازن بنائیں۔ یاد رکھیں صحت مند جسم کے اندر ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں خود کو عاجز و قاصر پاتے ہیں تو فوراً اس میدان کے کسی اچھے ڈاکٹر یا ماہر نفسیات سے رجوع کریں۔

(بہ شکریہ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا، لکھنؤ کے 17ر دسمبر 2000)

مترجم : محمد وصی اللہ ندوی

254, Phool Bagh, Lucknow

कौमी काउन्सिल बराए फरोग-ए उर्दू जबान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development, Department of Secondary and Higher Education, Government of India

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066.

Tel: 6103938, 6103381, 6179657 Fax: 6108159 E-mail: urducoun@ndf.vsnl.net.in

انتخاب غزلیات میر

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ شخصی زندگی کی حدوں کو سمیٹتا ہوا ایک آفاقی انسانی صورتِ حال کو ابھارتا ہے جس میں سایوں اور روشنیوں کی ایک طلسمی دنیا آباد ہے۔

دوسری اشاعت

255 صفحات — قیمت: 62 روپے

اردو کی کہانی

سیّد احتشام حسین

بچوں کی تعلیمی ضروریات نیز تعلیم بالغاں کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس طرح لکھی گئی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ابتدا سے موجودہ دور تک ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آجائے۔ کتاب میں ہاف ٹون کی 61 تصویریں بھی ہیں۔

دوسرا ایڈیشن

104 صفحات — قیمت: 21 روپے

امریکی ادب کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں

انیسویں صدی سے امریکہ میں ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو اپنی بعض خصوصیات میں دوسرے ممالک کے انگریزی ادب سے مختلف ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امریکی ادب کے تاریخی اور ثقافتی سیاق و سباق کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

دوسرا ایڈیشن

192 صفحات — قیمت: 52 روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات — قیمت: 98 روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات — قیمت: 200 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جس میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات — قیمت: 156 روپے

گلزار

خراجِ عقیدت

آخری کامریڈ کیفی اعظمی

کیفی صاحب آخری کامریڈ تھے۔ سیکولر اقدار کے عظیم مجاہد کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کی آواز تھے۔ اپنے آخری لمحوں تک وہ کمیونسٹ پارٹی کے فعال کارکن رہے۔ سوویت روس کے بکھر جانے کے بعد وہی ایسے شخص تھے جنھوں نے اشتراکیت کے پرچم کو بلند رکھا کیونکہ ان کی عقیدت روس سے نہیں، کمیونزم سے تھی۔ کمیونسٹ پارٹی میں ان کا بھرپور یقین ان کی تخلیقات میں خوب جھلکتا تھا — انھوں نے مزدوروں، دبے کچلے عوام اور ان کے مسئلوں پر لکھا، تمھارے اور میرے بارے میں لکھا۔

کیفی صاحب اپٹا (انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) کے بھی فعال کارکن تھے اور بعد کے دنوں میں اس کے صدر بھی رہے۔ تھیٹر کے حوالے سے ان کا رول اس لیے بہت اہم ہے کہ کمیونسٹ تحریک کے کمزور ہوتے ہوتے بھی انھوں نے پوری کوشش کی کہ اس کا تہذیبی عنصر زندۂ جاوید رہے۔ کبھی کبھار وہ نوجوان لکھنے والوں کو ناٹک لکھنے اور ان کو بھولا بھائی دیسائی ہال میں کھیلنے کی ترغیب دیتے تھے جس سے اکٹھا کیے ہوئے فنڈ کمیونسٹ پارٹی کو بھیج دیے جاتے تھے۔

ساحر لدھیانوی کی طرح کیفی خوبصورت رومانی شاعری بھی کرتے تھے۔ "کاغذ کے پھول" کے نغمے "وقت نے کیا کیا حسیں ستم" کو کون بھول سکتا ہے؟ ان کی نظم جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے "مکان"۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

میں جب بھی کیفی صاحب سے ملتا تھا اس نظم کا ذکر کرتا تھا۔

میں کیفی صاحب کو اس زمانے سے جانتا تھا جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعے وہ بہت سے نئے لکھنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ ساگر سرحدی، لاجپت رائے، سُکھبیر اور یہ ناچیز — وہ ہم کو منظم رہنے کی تلقین کرتے اور لکھتے رہنے کی تحریک دیتے تھے۔

وہ ایسی شخصیت کے مالک تھے جو عوام سے وابستہ رہی۔ نہ صرف بمبئی بلکہ اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ سے ان کا ناطہ بہت گہرا تھا۔ وہاں انھوں نے بے شمار سماجی نوعیت کے کام کیے — اسکول اور سڑکیں بنوائیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں اپنی بیٹی شبانہ پر بہت ناز رہا ہوگا جس نے ان کے پرچم کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بلند رکھا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب شبانہ اپنے کیریر کے شروعاتی دور میں تھیں، ان دنوں کیفی صاحب اکثر و بیشتر اعظم گڑھ جاتے رہتے تھے۔ ایک بار میں نے شبانہ سے پوچھا: "وہاں کیا کرتے ہیں"۔ "کیلے کے بارہ پیڑ ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں"۔ شبانہ کا جواب تھا۔ یہ ایک ایسی بیٹی کا جواب تھا جسے اپنے باپ سے جدا ہونا بالکل پسند نہیں تھا۔

(ہندستان ٹائمز، نئی دہلی، 11رمئی 2000)

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے
درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین
طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148، قیمت: 29.00

ہندوستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم
مترجم: سید غلام سمنانی

ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748، قیمت: 145.00

اتر پردیش کے لوک گیت

اظہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652، قیمت: 120.00

ارجمند آرا

روشنی کا مینار — کیفی اعظمی

قد آور ادبی شخصیت اور ترقی پسند تحریک کے اہم ستون کیفی اعظمی کی زندگی کی تکمیل کے ساتھ 10 مئی 2002 کو اردو شاعری اور ایک اہم ادبی تحریک کی تاریخ کا ایک اور اہم باب اپنے اختتام کو پہنچا۔ تاریخ کے سفر میں انسانیت کی سرفرازی کے لیے اٹھنے والی آوازیں، انسانیت کو اذیتوں اور تکلیفوں کی دلدل سے نکالنے کے نصب العین پر چلنے والی تحریکیں کبھی نہیں مرتیں، حساس ذہن کبھی نہیں مرتا، شاعر کبھی نہیں مرتا۔ کیفی صاحب کے جانے سے ایک دور ختم ضرور ہو گیا لیکن بنیادی انسانی اقدار میں یقین رکھنے والوں کے لیے بہتر مستقبل کی تلاش تاریخ کے تابناک میناروں کی روشنی میں کرنے والے سرپھروں کے لیے کیفی اعظمی ایک اور روشن منار کی طرح ایستادہ ہو گئے ہیں جن کا پیام وقت کی لہروں کے دوش پر مستقبل کے سمندر میں ہمیشہ محوِ سفر رہے گا۔

مذہبی زمیندار گھرانے میں پیدا ہونے والے سید اطہر حسین رضوی کو کیفی اعظمی بننے کے لیے ٹھوس سماجی حقائق کو، انسانیت کے کرب کو قطرہ قطرہ کر کے اپنے احساس میں ڈھالنا پڑا، آفاقی سچائیوں کی سرافرازی و سربلندی کو اپنے وجود کا حصہ بنانا پڑا، اسی لیے ان کی شاعری زندگی کا بھرپور احاطہ کرتی ہے، وہ احساس اور شعور کی حدبندیوں سے پرے تمام انسانی جذبات کی آواز بن جاتی ہے، تاریخ کا تسلسل بن جاتی ہے۔

انسانیت کی تکمیل کے خواہاں شاعر کو نظریاتی دائروں کا قیدی بنا کر رکھنے اور اس طرح اس کے قد کو کم کر کے دیکھنے والوں کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی سیاسی سماجی نظریے سے وابستگی، کسی کمیونزم، کسی ترقی پسندی کے لیے میدان میں اتر کر کام کرنے یا نہ کرنے سے انسان کے بنیادی مسائل اور ضرورتیں بدل نہیں جاتیں، آفاقی سچائیاں اپنا روپ نہیں بدل لیتیں۔ ان حقائق کے لیے کام کرنے والا، انسانیت کے لیے درد رکھنے والا خواہ کسی حلقے سے تعلق رکھتا ہو، اس کے خیالات، اس کے کام اور اس کا مقصدِ حیات ہمیشہ سربلند رہے گا۔ اپنے ذاتی احساسات کو آفاقیت کا جامہ پہنانے والا شاعر اپنی تمام ترفنی صلاحیتوں کو اگر ان اقدار کے نام کر دے تو کیا اس سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے؟ کوئی اس کے فن پر حرف زنی کر سکتا ہے؟ کوئی اس کے قد کو گھٹا سکتا ہے؟ شاید کبھی نہیں۔

"مکان" کے روپ میں انسان کے لیے پناہ گاہ کی تلاش اور "ابن مریم" میں انسان کی سربلندی اور نجات دلانے میں مذہب کی ناکامی پر نوحہ گر شاعر کو ہرگز کسی ایک گروہ کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔

اپنی زندگی کے شروع زمانے ہی میں کیفی صاحب انقلابی قومی تحریک کے پرجوش حامی بن گئے تھے۔ وہ کمیونسٹ تھے اور گذشتہ صدی کے چوتھے دہے میں ترقی پسند تحریک کا حصہ بن کر انھوں نے اپنی عملی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، فیض، علی سردار جعفری، کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، جاں نثار اختر، رشید جہاں، احمد علی، مجاز اور عصمت چغتائی جیسے تخلیق کاروں کی کہکشاں میں کیفی بھی شامل تھے اور ان میں اکثر نے دیر تک اپنے نصب العین کو اپنی ذاتی خواہشات سے بلند رکھا۔

کیفی صاحب کے اشتراکی نظریات نے بنیادی انسانی اقدار میں ان کے یقین کو مستحکم ہی کیا، ان کو زیادہ اعتماد کے ساتھ اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ملک کو درپیش مختلف مسائل پر اپنے خیالات کے بیباک اظہار کی تحریک دی۔ اپنے نصب العین اور اقدار کے لیے کیفی صاحب کے کمٹ منٹ کا سب سے بڑا ثبوت فالج جیسے موذی مرض پر ان کی قوتِ ارادی کی فتح ہے۔ 1972 میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو کون سوچ سکتا تھا کہ وہ اپنا تخلیقی سفر اور اقدار کے لیے اپنی جدوجہد اتنے جوش و خروش سے جاری رکھ سکیں گے کہ ہوا کا رخ بدل دیں گے، لیکن انھوں نے ایسا کیا اور کامیابی حاصل کی۔

اپنی اقدار، اپنے نصب العین اور اپنے نظریات کو کیفی صاحب نے اپنے اندر کے حساس شاعر اور مستحکم قوتِ ارادی والی شخصیت کے ساتھ جس طرح ہم آہنگ کیا اور ہر اعتبار سے اپنے اصولوں کو اپنی ضرورتوں سے ماورا کر کے جو کامیاب زندگی گزاری وہ ہم سب کے لیے قابلِ تقلید ہے اور ان کا یہ پیغام ہم سب کے لیے امید کی کرن اور تحریک کا باعث:

زندگی جہد میں ہے، صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

☆☆☆

کیفی اعظمی

نظم

زندگی

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ میری بیٹی کے وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تنِ مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی پیراج کو اپنا نہ دیا

آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
میرے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
"میں" پگھل کر مرا کر کمزور سا "میں"
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا

رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا

کاٹ کے رکھ دیے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کیے اتنے کہ خوں کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آئیں
اور کمر سے مرے سر تک آئیں

سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح

اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ مچلتے شعلے
کھینچ لیں جوش میں سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے تجھے
ایسا کوئی راگ ملے

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
دفعتاً دور سے کانوں میں یہ آواز آئی
بدھم شرنم گاچھامی
دھمم شرنم گاچھامی
سنگھم شرنم گاچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے وستر سے ڈھانپا یہ بدن
پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچوں کو بنا پیار کیے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لیے
چاہتا تھا کہ کہیں بھکشا میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو، دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی نے یہ کہا
تیرے اک گال پہ، جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کر دے
یہی جینے کا طریقہ بھی ہے، انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، یہ مری آواز بھی ہے
میں اٹھا جس کو اہنسا کا سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آ رہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو
کسی مینار سے نیچے آ کر
اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پرجوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو میں پہنچا جہاں
میں نے دہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان

کل من علیہا فان

ایک طرف جھک گیا خورشید جہاں تاب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی
شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہوا مجروح دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا صدیوں سے جو جلتا ہے چراغ

پھر سمندر جو بڑی دیر سے طوفان میں تھا
ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور کہا شیو نے بھجوایا ہے
آج شیو علم ہے، امر ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لیے آئی تھی

بیوی بچوں نے مرے
اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لیے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لیے
رات کی لاش ملی پانی میں

□□□

کیفی اعظمی ــــ مختصر سوانحی خاکہ

تاریخ پیدائش : 1925
تاریخ وفات : 10/ مئی 2002 بروز جمعہ
عمر : 77 سال
اولاد : ایک بیٹا بابا اعظمی اور ایک بیٹی، مشہور فلم اداکارہ اور رکن پارلیمنٹ شبانہ اعظمی
خاندانی نام : سید اطہر حسین رضوی
والد کا نام : سید فتح حسین
جائے پیدائش : موضع مجواں، ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش
ابتدائی تعلیم : گھر میں ہوئی۔
عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی میں ہوئی۔

شاعری کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا، ان کے والد کبھی کبھی فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان سے بڑے تین بھائی بھی تھے۔

- پہلا مجموعہ کلام "1943 میں شائع ہوا
- دوسرا مجموعہ کلام "آخر شب" 1947 میں شائع ہوا
- تیسرا مجموعہ کلام "آوارہ سجدے" 1973 میں شائع ہوا
- چوتھا مجموعہ کلام "میری آواز سنو" (فلمی گیت) 1947 میں شائع ہوا
- ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) 1977 میں شائع ہوا۔

ان کی آخری کتاب "سرمایہ" 1994 میں شائع ہوئی۔ انھیں جو انعامات اور اعزازات ملے ان میں کچھ یہ ہیں:

- اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ "آوارہ سجدے" پر۔
- مہاراشٹر اردو اکادمی کا مخصوص ایوارڈ "آوارہ سجدے" پر۔
- سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ "آوارہ سجدے" پر۔
- ساہتیہ اکادمی ایوارڈ "آوارہ سجدے" پر۔
- لوٹس ایوارڈ (مکمل ثقافتی خدمات پر)۔
- نیشنل انٹیگریشن کا پریسیڈنٹ ایوارڈ (سات ہندستانی کے ایک گیت پر)
- بہترین کہانی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ (جو انھوں نے قبول نہیں کیا)
- بہترین کہانی کا فلم فیئر ایوارڈ
- بہتری فلم اسکرین پلے کا فلم فیئر ایوارڈ
- بہترین فلم مکالمے کا فلم فیئر ایوارڈ
- ثقافتی خدمات پر مہاراشٹر ریاست کا "گورو ایوارڈ" (نقد ایک لاکھ روپے)
- پدم شری (فلمی اور ثقافتی خدمات پر پدم شری کا خطاب ملا جو انھوں نے اردو کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اپنانے کے خلاف واپس کردیا)
- ثقافت اور عوامی خدمات پر اتر پردیش حکومت کا ایوارڈ (ایک لاکھ روپے)
- ساہتیہ اکادمی فیلوشپ ایوارڈ
- ایفرو ایشین لیکھک ایوارڈ
- دلی سرکار اردو اکادمی کے ملینیم ایوارڈ سے نوازا گیا، جس کے تحت انھیں 11 لاکھ روپے نقد، ایک شال اور مومینٹو پیش کیا گیا تھا۔
- 1998 میں مہاراشٹر سرکار کی طرف سے "گیانیشور ایوارڈ" دیا گیا۔
- 1999 میں دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامے "آپ کی کائنات" کی جانب سے "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" سے نوازا گیا، جسے ان کی بیماری کے باعث شبانہ اعظمی نے وصول کیا۔
- حال ہی میں ساہتیہ اکادمی نے اپنا اعلیٰ ترین اعزاز، فیلوشپ، ان کو ممبئی کے جسلوک اسپتال میں جاکر تفویض کیا تھا۔

(بہ شکریہ راشٹریہ سہارا دہلی)

□□□

کیفی اعظمی

پسِ سخن

میں نے شاعری کیوں شروع کی، شاعر کیسے بنا (اگر آپ مجھے شاعر سمجھتے ہیں)، اس کی تحقیق کے لیے کسی محقق کی ضرورت نہیں۔ میں نے جس گھر میں جنم لیا اس میں شاعری رچی بسی ہوئی تھی۔ سیاست سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اس کو سمجھنا اور سمجھانا میرے لیے بھی مشکل ہے۔ میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی جہاں گزاری وہاں باہر کی ہوا بھی مشکل سے آتی تھی۔ شہروں میں کیا ہو رہا ہے، کانگریس کیا کر رہی ہے، مسلم لیگ کیا کر رہی ہے، اس کا ذکر بھی وہاں نہیں آتا تھا۔ بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں بھی نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام بھی آیا کہ جو گیہوں بونا چھوڑ دو، نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی۔ میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انھوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت اور تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے، اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے اس لیے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو، بھنے ہوئے بیج اگ نہیں سکتے اور جب وہ اگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیتی کے لیے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ دادا مرحوم نے خود یہی کیا اور ان کے مشورے پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ جب نیل کے بیج نہیں اگے تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے۔ لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے۔ دادا مرحوم پر مقدمہ چلا، جائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا۔ دادا مرحوم نے کمپنی کے خلاف نفرت کا جو بیج نیل کے کھیتوں میں بویا تھا وہ ایک دن میرے سینے میں پھوٹا اور پھولا پھلا۔ میری عمر کوئی 9'10 برس کی ہو گی جب میں نے سنا کہ ہماری تحصیل میں ایک گورا کلکٹر آ رہا ہے جس نے اعظم گڑھ کے زمینداروں کو بہت ستایا ہے، جو بندوبست سے بہت نفرت کرتا ہے۔ میں نے اپنی عمر کے لڑکوں کو جمع کیا، بہنوں کے کالے دوپٹے چرا کے پھاڑے اور کالے جھنڈے بنائے اور چوری چوری تحصیل پہنچ گئے کہ جب وہ بندہ آئے گا تو ہم اس کو کالے جھنڈے دکھائیں گے۔ کلکٹر بہت دیر میں آیا تھا۔ تھانیدار جو ابا کے پاس اکثر آتا تھا اس نے ہم کو دیکھ لیا اور مجھے پکڑ کے ابا کے پاس لایا۔ ابا کسی غیر کے سامنے ہم کو کبھی نہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے، لیکن انھوں نے ہم کو سمجھایا بہت کہ اب ایسا نہ کرنا۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ ہم جنگل میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک ببول کے درخت میں کہیں ایک چٹکی روئی اڑ کے آئی اور کانٹوں میں پھنس گئی ہے۔ میں نے انگلیوں کو کانٹوں سے بچاتے ہوئے وہ روئی نکال لی۔ اب میں اور میرے ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے اور سوچ رہے تھے کہ ببول میں روئی کہاں سے آ گئی۔ کچھ دور پر آم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ آدمی زمین پر کمبل بچھائے لیٹا سو رہا تھا۔ میں روئی لیے اس کے پاس پہنچا اور روئی دکھا کے اس سے پوچھا کہ چاچا ببول کے پیڑ میں روئی کہاں سے آ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے ہم کو سمجھایا کہ بابو جب سے مہاتما گاندھی نے چرخہ کاتنا شروع کیا ہے بھگوان بھی ہر جگہ روئی پیدا کرنے لگا ہے۔ میں سر کھجانے اور سوچنے لگا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ گاندھی جی چرخہ کاتتے ہیں۔ اس وقت کا ہندستان ایسا ہی تھا لیکن میرے گھر پر سیاست کا سایہ نہیں پڑا۔ ایک بات جس پر مجھے فخر ہے اور جو قابلِ ذکر بھی ہے یہ کہ میرے گھر پر کبھی فرقہ پرستی کا بھوت نہیں منڈلایا۔ بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں آتے تو ان کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کی خبریں بھی آتیں، کبھی کھانے پر یا چائے پر گاندھی جی اور ان کی بکری کی بات چھڑتی یا یہ کہانی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے دھل کے آتے ہیں۔ مجھے ان باتوں میں دلچسپی تو بہت تھی لیکن کوئی روشنی نہیں ملتی تھی۔ جب لکھنؤ آیا وہاں سوراج کا آندولن بہت زوروں پر چل رہا تھا۔ میں پربھات پھیریوں میں شامل ہو گیا۔ منہ اندھیرے کسی پربھات پھیری میں میں شامل ہوتا اور نظمیں پڑھتا۔ اس مجموعے میں جھنکار کی جو نظمیں ہیں، مثلاً اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے، یہ ایک پربھات پھیری کے لیے میں نے کہی اور اسی میں پڑھی تھی۔ شہر میں ستیہ گرہ بھی ہو رہی تھی۔ بدیشی کپڑے دوکانوں سے نکال نکال کر جلائے جا رہے تھے۔ امین آباد میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دوکان تھی۔ اس میں سے بدیشی کپڑوں کے تھان نکال کر سڑک پر جلائے جا رہے تھے۔ میں بھی اس دلچسپ کام میں شریک ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی اور ہم سب پکڑے گئے، میں بھی۔ جب ایک حوالدار نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اپنی لاری میں بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ میرے محلے کا

ایک لڑکا کچھ دور پر سائیکل رو کے کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔ میں نے پکار کے اس سے کہا میرے گھر میں بتا دینا کہ میں جیل جا رہا ہوں۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں گاندھی جی اور جواہر لال کی صف میں شامل ہو گیا ہوں۔ نشہ اس وقت اترا جب عالم باغ پہنچ کے لاری رکی اور پولیس نے مجھے اور میری عمر کے کچھ اور لڑکوں کو اتار کے ہلکی سی ہماری کیتنک کی اور چھوڑ دیا بس اب گھر بھاگ جاؤ۔ میرا دل ٹوٹ گیا میں سیدھا امین آباد کانگریس کے دفتر میں پہنچا اور میں نے پولیس کی شکایت کی کہ مجھے پولیس جیل نہیں لے گئی، اب میں اپنے گھر جا کے کیا بتاؤں گا۔ ایک بزرگ لیڈر نے مجھے بہت تسلی دی، ابھی تم بہت کم سن ہو لیکن جیل جانے کا اتنا شوق ہے تو کام کرتے رہو کسی دن جیل چلے ہی جاؤ گے۔ میں آنسو بھرے ہوئے گھر لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کام کرنا چاہیے کہ ضرور ہی جیل جاؤں۔ ہمارے گروپ میں ایک بنگالی نوجوان بھی تھا۔ اس نے ہم کو بم بنانے کا نسخہ دیا، ہم نے بم بنایا اور طے کیا کہ وزیر گنج تھانے پر ہم بم پھینکیں گے جس کے انسپکٹر نے ہم کو چھوڑ دیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ جب بم تیار ہو گیا تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ تھانے پر پھینکنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ بم بنا بھی ہے یا نہیں۔ ہم لوگ گومتی کے کنارے شمشان گھاٹ کی طرف گئے اور وہاں سناٹے میں ہم نے بم کی آزمائش کی تو معلوم ہوا کہ وہ انار بن گیا (آتش بازی والا)۔ میں نے اپنے بنگالی دوست کو خوب گالیاں دیں، مار پیٹ بھی ہوئی اور اس کو اپنے گروپ سے نکال دیا۔

بہت دنوں تک اسی طرح بھٹکتا رہا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس وقت ایک ایسا رومانک حادثہ ہوا کہ میں لکھنؤ چھوڑ کے کانپور چلا گیا۔ وہاں مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہوا۔ وہ چوری چوری مجھے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینے لگے۔ اب مجھے وہ راستہ مل گیا جس پر میں نے زندگی کا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہو جانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں۔ ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہو جائے گا — منزل پر یا منزل کے قریب۔

7 رنومبر 1989 (مجموعہ کلام "سرمایہ" سے ماخوذ۔
بہ شکریہ "کیفی اعظمی" مرتبہ الطہرنبی، شاہنواز قریشی)

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت
رشید الدین خاں
اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔
صفحات:684، قیمت: 58.00

حیات جاوید
الطاف حسین حالی
سر سید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سر سید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان --
چوتھا ایڈیشن
صفحات: 907، قیمت:167

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام
رشید الدین خاں
مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف ---
دوسرا ایڈیشن
صفحات:336، قیمت 76.00

املانامہ
اردو املا میں یکسانیت اور باقاعدگی لانے کے لیے ماہرین پر مشتمل کمیٹی کی سفارشات ---
مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ
(نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن)
صفحات:129، قیمت: 9.00

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ
سید احتشام حسین
اردو ادب کی تمام اصناف کا مختصر مگر جامع تعارف، تاریخی حوالوں کے ساتھ طلبہ کے لیے بہ طور خاص کارآمد---
چوتھا ایڈیشن
صفحات:334، قیمت 70.00

شعریات
ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ اور تعارف
شمس الرحمن فاروقی کے قلم سے
ہر ادبی لائبریری میں اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے
تیسرا ایڈیشن مع اضافہ جدیدہ
صفحات:136، قیمت: 62.00

شیاما چرن دُوبے "ہندستانی گاؤں" سے اقتباس

ہندستانی گاؤں

بہ حیثیتِ مجموعی ہندستان ایک زرعی اور دیہی ملک ہے۔ اس کے باشندوں کی بڑی اکثریت دیہی علاقوں میں بستی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق جس زمانے میں ہندستان غیر منقسم تھا، اس ملک میں سات لاکھ گاؤں تھے۔ تقسیم کے بعد گو یہ تعداد کم ہو گئی ہے تاہم آبادی کا دیہی شہری تناسب کسی قدر کمی زیادتی کے ساتھ ہنوز وہی ہے۔ مختلف اندازوں کے مطابق ہندستان کی ستر یا اسی فی صد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔

قدیم زمانے سے گاؤں ہندستان کی سماجی زندگی کی بنیادی اور اہم اکائی رہا ہے۔ ملک کے کلاسیکی ادب میں اس کے ذکر کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ مثلاً رگ وید (Rigveda) کے مطابق (جس کا شمار عام طور پر دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصف آخر سے کیا جاتا ہے) سماج کا ارتقا عروجی سمت میں مسلسل رہا ہے۔ جس کی ابتدا خاندان، گریہہ یا کولہ (Griha or Kula) سے ہوئی اور جو آہستہ آہستہ بڑھ کے گاؤں (گرام Grama)، قبیلہ (وس Vis)، عوام (Jana) اور ملک (Rashtra) تک پہنچ گیا۔ لفظ گرام سے، جس کا استعمال اس وقت بھی ہندستان میں زیادہ تر گاؤں کے لیے کیا جاتا ہے، مراد متعدد خاندانوں کا مجموعہ تھا جو ایک ہی جگہ سکونت رکھتے تھے۔ رگ وید (Rigveda) سے ہمیں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کا ایک سردار یعنی گرامنی (Gramini) ہوتا تھا لیکن گاؤں کی اندرونی ساخت یا انتظامیہ یا اس کے بیرونی الحاق کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ مابعد وید کے ادب، بالخصوص رزمیہ نظموں میں ہمیں اس زمانے کے نظم و نسق کی کسی قدر تفصیلی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مہابھارت (دوسری صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک) میں ہمیں مختلف قسم کی بستیوں اور آبادیوں کے تذکرے ملتے ہیں مثلاً مویشی کھیت (Cattle Farms)، گھوش یا ورجا (Ghosh or Varaja)، چھوٹے نیم مہذب کھیڑے (Palli)، پڑوسی بستیوں کے حفاظتی قلعے (Durga)، ان قلعوں کے اطراف گاؤں (Grama)، قصبے (Kharvata or Path) اور شہر (Nagar)۔ مہابھارت میں ہمیں دیہی نظام اور گاؤں کے مابین تنظیم کا خاکہ بھی ملتا ہے۔ مہابھارت کے مطابق گاؤں نظم و نسق کی بنیادی اکائی تھا اور گرامنی (Gramini) اس کا سردار اور نمائندہ ہوتا تھا۔ اس چودھری کی ایک بڑی ذمے داری یہ تھی کہ وہ گاؤں اور اس کی حدود کی، دو میل کے دائرے میں حفاظت کرے۔ نظم و نسق دیہاتی گروہوں کی بنیاد پر ہوتا تھا جس میں ہر گروہ کا ایک مسلمہ چودھری ہوتا تھا۔ اس طرح دس گاؤں کا ایک گروہ دس گرامنی (Das Gramini) کے تحت ہوتا تھا اور یہ بین دیہی تنظیم کی پہلی اکائی تھی۔ ایسے دو گروہ یعنی بیس گاؤں وم ستپا (Vim Satipa) کے تحت ہوتے تھے۔ ایک سو دیہات کے گروہ کا سردار ست گرامنی (Sat Gramini) یا گرام ستادھیکشا (Gram Satadhayaksha) کہلاتا تھا۔ آخر میں ایک ہزار دیہات کا ایک گروہ ادھی پتی (Adhipati) کے تحت ہوتا تھا۔ بعد کی متعدد تصانیف میں اس موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن پھر بھی ہمیں قدیم ہندستان کے دیہی اور بین دیہی نظام کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ یہاں منو کی تحریرات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جس میں گاؤں کا ذکر موجود ہے (دوسو قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک)۔ اس مشہور ہندو قانون داں نے جس کے اصول ہندو سماج کو آج بھی راہ دکھاتے ہیں، بستیوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں: گاؤں (Grama)، قصبہ (Pura) اور شہر (Nagar)۔ اس کے مطابق گاؤں نظم و نسق کی بنیادی اکائی تھا جس کی اپنی تنظیم اور عہدے دار ہوتے تھے۔ گرامنی (Gramini) گاؤں کا سردار ہوتا تھا۔ سماجی مذہبی زندگی کے مختلف شعبوں سے قطع نظر جس میں خاندان، قبیلے، ذات پات، اور دیہات سب برابر کے شریک تھے، دیہی اکائی کی اپنی علاحدہ ذمے داریاں بھی ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ عوامی مفاد کی چیزیں مثلاً کنویں، تالاب، حوض، خزانۂ آب، بند، گوشالہ، باغات، مزرعے وغیرہ کا انتظام اور اس کی دیکھ بھال گاؤں کے تحت تھی۔ تقریباً ایک ہزار گاؤں کا ایک ملک سمجھا جاتا تھا اور یہ سہاسریسا (Sahasresa) کے تحت ہوتا تھا۔ اس گروہ کی متعدد تقسیمیں اور ذیلی تقسیمیں ہوتی تھیں۔ ستیسا (Satisa) کے تحت ایک سو گاؤں ہوتے تھے۔ بیس دیہات ایک ومسی (Vimsi) کے تحت، دس دیہات ایک داسی (Dasi) کے تحت اور آخر میں ایک گاؤں گرامنی کے تحت ہوتا تھا۔ زمانہ دراز گزرنے کے باوجود ہندستانی دیہات کی ساخت میں اب بھی وہ بیشمار خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا ذکر منو نے کیا ہے۔ آج بھی دیہات کا نیم خود مختارانہ کردار باقی ہے۔ بالعموم ہر گاؤں کا ایک مسلمہ سردار ہوتا ہے جس کی ذمے داریاں مقرر ہوتی ہیں۔ دس یا بیس گاؤں آج بھی اہم مقدمات اور مفادِ عامہ کے مسائل پر غور کرنے کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار

گاؤں ثقافتی یا ذیلی ثقافتی حلقہ کہلاتے ہیں اور اس علاقے کی دیہی جماعتوں کی ایک مشترک ثقافتی خصوصیات، سماجی قدریں اور سماجی اشکال ہوتی ہیں۔ تاہم ہندستانی دیہی سماج کو ہم غیر حرکی، غیر متغیر اور زمان و مکان سے آزاد نہیں کہہ سکتے ہیں۔ تاریخی اور سماجیاتی عوامل اور قوتوں کے بین عمل نے دیہی گروہوں کی ساخت، اس کی تہذیب اور اس کی تنظیم پر بہت سے گہرے اور اہم اثرات ڈالے ہیں۔

•

آج کل ہندستانی گاؤں یا ہندستانی کسان کی اصطلاحات کا استعمال عام ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ہندستان کے سارے علاقوں کے بیشتر مسائل یکساں ہیں لیکن اس قسم کے تذکروں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دیہات سماجی اور ثقافتی اکائی کی حیثیت سے ہندستان کے ذیلی براعظم میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی تنظیم اور ایک ہی قسم کے اقدار رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا سمجھنا پیچیدہ سماجی موقف کو بہت زیادہ آسان بناکر پیش کرنے کے مترادف ہوگا کیوں کہ ان کی سماجی ساخت اور مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ صاف اور واضح طریقے پر ان کی درجہ بندی کی جائے۔ اس طرح کی درجہ بندی کے لیے مختلف معیارات پیش نظر رکھے جاسکتے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(1) وسعت، آبادی اور رقبہ
(2) نسلی ساخت۔ ذات پات
(3) زمین کی ملکیت کا طریقہ
(4) اقتدار کا ڈھانچہ اور اس کی درجہ بندی
(5) علاحدگی کے مدارج
(6) مقامی روایات

بہ لحاظ آبادی، وسعت اور اپنے حدود کے تعین کی غرض سے ہندستان کے ہر ہر تہذیبی خطے میں دیہاتی اکائیوں کے اپنے جدا جدا نام ہیں۔ شمال اور وسط ہند میں جہاں ہندی بولی جاتی ہے، عام طور سے کھیڑہ (چھوٹا پورہ یا Hamlet)، گاؤں (چھوٹی بستی Small Village) اور قصبہ (بڑی بستی Large Village) میں فرق کیا جاتا ہے۔ نیز تلنگانہ میں جو حیدرآباد اسٹیٹ کا حصہ ہے جہاں تلگو بولی جاتی ہے اور جس میں شامیرپیٹھ شامل ہے، اسی طرح کا امتیاز گمپو (Gampu)، ماجرا (Majra) اور گراما (Grama) کے ناموں میں کیا جاتا ہے۔ پہلے نام سے مراد چند جھونپڑیوں کا مجموعہ ہے، دوسرے سے کسی قدر بڑا پورہ اور تیسرے سے خاص گاؤں۔ دیہی آبادی میں اس طرح کی جو تفریق ہے اس کا انحصار صرف ان کے پھیلاؤ اور آبادی پر ہی نہیں ہے اگرچہ کہ ان تینوں کا تعلق لوک سماج (Folk Society) سے ہے لیکن وہ اپنی اندرونی تنظیم، معاشی خود کفالت، بیرونی دنیا سے باہمی مطابقت کے طریقوں، نیز دیہی سماج میں آپسی اثر اور وقار کے معاملات میں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے مماثل سمجھنے کی ہر کوشش سماجیاتی حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔ بڑے گاؤں کے باشندے اپنے کو دیہی سماج کا رہنما سمجھتے ہیں، چھوٹے گاؤں کے باشندوں کو کسی قدر کم تہذیب یافتہ اور جو لوگ کھیڑے سے آتے ہیں، ان کو گنوار سمجھتے ہیں۔ چھوٹے گاؤں کا آدمی بڑے دیہات کے باشندوں کو مشتبہ اور تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے لیکن دل ہی دل میں وہ ان کی عزت اور توقیر بھی کرتا ہے مگر اس کو بھی اپنے سے چھوٹی بستیوں کے لوگ بے ڈھنگے اور گنوار نظر آتے ہیں۔ چونکہ دیہات میں پیشے کی تقسیم بڑی حد تک ذات پات کی بنا پر ہوتی ہے اور نہ صرف کاشتکاری کے کاموں کے لیے بلکہ مذہبی اور سماجی زندگی کے لیے بھی بہت سے پیشہ وروں کے کام کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ بڑا گاؤں جس کی آبادی کے اندر تمام پیشہ ور ذاتیں ہوتی ہیں، زیادہ مکمل، معاشی طور پر خود مکتفی اور بہتر سماجی مذہبی زندگی گزارتا ہے بہ نسبت اس چھوٹے دیہات کے جو ایک یا اس سے زیادہ پیشہ ور ذاتوں کی عدم موجودگی میں متبادل انتظام کے لیے دوسری بستیوں پر انحصار کرتا ہے۔ مختلف ذاتوں، بڑی آبادی اور مسائل کی اندرونی پیچیدگی کی وجہ سے بڑے گاؤں کی تنظیم اکثر چھوٹے گاؤں سے مختلف ہوتی ہے۔ بعض دیہات اور کھیڑے حقیقت میں بڑے گاؤں کے توسیعی دیہات سمجھے جاتے ہیں اور اگرچہ کہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتے ہیں پھر بھی وہ پڑوسی بڑے دیہات کے اصول و نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔

کسی گاؤں کے کردار کا تعین وہاں کی نسلی اور لسانی ساخت، نیز ذات پات کے ڈھانچے سے ہوتا ہے۔ ایک قبیلے والے گاؤں کی ساخت، اس کی تہذیب اور مسائل اس گاؤں سے بالکل مختلف ہوں گے جہاں کی آبادی مخلوط اور متجانس ہو۔ ایک قبیلے والے گاؤں میں اکثر اقتداری ساخت کے لحاظ سے ایک یگانگت ہوتی ہے کیوں کہ یہاں غیر مذہبی، رسمی اور گاؤں کے تہذیبی معاملات میں قبیلے کا اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک ایسا گاؤں جس کی آبادی میں ایک طرف ملے جلے مختلف قبیلے ہوں اور دوسری جانب ہندو ذاتوں کے یا ایک ہی درجے کی ذات کے دو ایسے متوازی گروہ ہوں جن کو محض مختلف زبان بولنے یا مختلف تہذیبی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے علاحدہ سمجھا جاتا ہو یا اُن میں فرق ہندو یا مسلمان ہونے پر ہو تو ایسی صورتوں میں اس گاؤں کی اندرونی تنظیم اور اقتدار کی مقامی حالت لازماً مختلف ہوگی۔ اگر اس کی

آبادی کے مختلف عناصر مساوی طاقت رکھتے ہوں — بہ لحاظ تعداد اور بہ لحاظ معیشت — تو عموماً اس کا انتظامیہ وفاقی ہوگا۔ ایسے بندوبست میں ہر ثقافتی گروہ نیم خود اختیاری ہوگا اور ان تمام گروہوں سے لیا ہوا اقتدار بحیثیت مجموعی غیر معمولی قوت کا حامل ہوگا۔ ایسے علاقوں میں جہاں بین ذاتی رقابتیں اور کشیدگی شدید یا مسلمہ ہیں، ایسے گاؤں میں ذات پات کی ساخت پر ہی بین گروہی مطابقت کا انحصار ہوگا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایک زرعی ملک میں زمین کی قدر بے انتہا ہوتی ہے اور آبادی کا دباؤ، نیز خانگی مالکانہ سماجی وقار کے لیے بھی اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جہاں زمین کا مالک ایک ہی زمیندار ہو یا دو یا زیادہ زمیندار ہوں، جیسا کہ "مشترک گاؤں" میں ہوتا ہے، ایسے گاؤں کی تنظیم اس گاؤں سے بالکل مختلف ہوگی جہاں مالکانہ حقوق رکھنے والے بستے ہوں۔ زمین کی تقسیم کا عام تناسب دو یا اس سے زیادہ ذاتوں، چند خاندانوں یا ایک بڑے زمیندار اور باقی تمام معاشرے میں گاؤں کی تنظیم اور اس کے مسائل پر زیادہ اثر انداز ہوگا۔

ہندستان کا کوئی گاؤں پوری طرح خود اختیار یا آزاد نہیں ہے کیوں کہ یہ ہمیشہ کسی نہ کسی وسیع تر سماجی نظام کی اکائی ہوتا ہے اور ایک منظم سیاسی معاشرے کا جزو۔ کوئی فرد صرف گاؤں کی کمیونٹی کا ہی ممبر نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق کسی ذات، مذہب یا قبیلے سے بھی ہوتا ہے جس کی عملداری کافی وسیع ہوتی ہے اور جو کئی دیہاتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اکائیاں خود اپنی تنظیم، اقتدار اور مراعات رکھتی ہیں۔ سیاسی طور پر تمام دیہات انڈین یونین اور اس کی کسی ایک ریاست کی مقننہ، عاملہ اور عدلیہ کے زیر اقتدار ہوتے ہیں۔ انتظامی سہولت کی غرض سے ریاستوں کو ضلعوں میں اور ضلعوں کو تحصیل اور تعلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ روزمرہ کے نظم و نسق کے دوران دیہات کا تعلق اس ذیلی تقسیم اور ضلعوں کے حاکموں اور عہدے داروں سے ہوتا ہے، اگرچہ کہ ریاستی اور مرکزی قوانین ان پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس طرح دیہات صرف اپنے مقامی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے؟ کیا کوئی چھوٹا وفاقی جاگیر دار ہوتا ہے جو عاملانہ اور عدالتی اختیار بھی کر سکتا ہے؟ کیا کوئی حکومت کا مسلمہ زمیندار ہوتا ہے جس نے بیجا طور پر ہر نظم و نسق کا اختیار حاصل کر لیا ہے؟ یا گاؤں کی ایسی کوئی پنچایت (دیہی مجلس) جو مقامی رواج کی آوردہ ہوتی ہے؟ جاگیر دارانہ نظام کو جمہوریہ ہند برخاست کر چکی ہے لیکن ملک کے کچھ حصوں میں چھوٹی جاگیر داریاں اب بھی پائی جاتی ہیں اور گاؤں کے زمیندارانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے صرف چند ہی علاقوں میں موثر اقدام کیا گیا ہے۔ دوسری جانب دیہی سیلف گورنمنٹ (Self Government) یا خود حکومتی طریقے کے احیا کے لیے کچھ ریاستوں نے دیہی مجالس قائم کی ہیں جن کو قانونی اختیارات دیے گئے ہیں اور جن کے اراکین کا تقرر حکومت کی جانب سے ہوتا ہے۔ ہندستانی گاؤں میں جماعتی اقتدار کی صورت گری خاص نوعیت کی حامل ہوتی ہے جن کے ذریعے ہندستانی دیہاتوں کی مختلف تصویریں ملتی ہیں۔

بڑے تعلیمی یا صنعتی مراکز سے قرب یا دوری گاؤں کی تنظیم اور دنیا سے متعلق اس کے نظریات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح جدید ذرائع حمل و نقل کی دستیابی، رسل و رسائل کی آسانیاں کسی گاؤں کے موتف اور اس کے تانے بانے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کی درجہ بندی کے لیے ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ دیہی تانے بانے کا انحصار بعض سماجی اور علاقائی روایات پر ہوتا ہے۔ لباس، بات چیت، اطوار نیز دیہات کی ہیئتی تشکیل اور مکانات کا طرز تعمیر اس کے خاص تہذیبی نمونوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ گویا مختلف علاقوں میں دیہات کی تنظیم میں ہم ایک حد تک تنوع کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن ان علاقائی اختلافات کے باوجود دیہات میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی طرز کی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ کچھ دیہات کو امن پسند اور کچھ کو دقت پسند سمجھا جاتا ہے۔ کچھ اپنی فیاضی اور راست بازی کے لیے مشہور ہوتے ہیں اور کچھ کج خلقی کے لیے بدنام۔ کچھ ایمانداری اور کھرے پن کے لیے مشہور ہیں تو کچھ پر اُن کی آرام طبعی کے باعث نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ کچھ گاؤں مقدمہ بازی سے دلچسپی رکھنے کے لیے مشہور ہیں تو دوسرے اپنی شان اور ظاہری نمائش کے اظہار پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ایسے بھی دیہات ہیں جن کو اپنی نیک نامی کا بے حد احساس ہوتا ہے۔ میل ملاپ یا اس کا فقدان بھی چند دیہات کی خصوصیات میں ہے۔ ان خصوصیات اور اوصاف کی جڑ شدید مقامی روایات میں پائی جا سکتی ہے یا ایسے عناصر کے ملاپ میں جو کسی خاص وقت میں رائج رہے ہوں۔ یہی چیزیں دیہات کو ایک امتیازی کردار عطا کرتی ہیں۔ اس لیے ایسے دیہات کے سماجی طریقوں، طریق اور محرکات کا مطالعہ بڑی سماجیاتی اور نفسیاتی اہمیت کا حامل ہوگا۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے پیش نظر کسی دیہات کو دیہی ہندستان کا نمونہ یا نمائندہ سمجھنا دشوار ہے۔ در حقیقت میں تو یہ کہوں گا کہ ایسا گاؤں اپنے ثقافتی علاقے کا بھی بمشکل ہی نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ سماجی انسانیات داں اور ماہرین سماجیات کے لیے بہت پیچیدہ ہے اور آج اس کی ضرورت ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے دیہی سماج کی تنظیم کے مختلف النوع نمونوں اور تہذیب کا مسلسل مطالعہ کیا جائے۔ جب تک ایسا نہ کیا

جائے گا، یہی ہندستان میں دیہی سماجی نظام کی تصویر دھندلی اور نامکمل نظر آئے گی۔

قدیم نسلیاتی مطالعوں اور ان ابتدائی تحقیقات کی مدد سے جو حال میں شائع ہوئی ہیں، ہندستانی دیہات کی ساخت اور تنظیم کا خاکہ اب نسبتاً زیادہ واضح نظر آرہا ہے۔ اہم اختلافات سے قطع نظر ان میں ساخت کے لحاظ سے بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شمالی وسطی اور جنوبی ہند میں، نیز ملک کے مشرقی اور مغربی حصے میں حسب ذیل خصوصیات بیشتر دیہاتوں میں نظر آتی ہیں:

(1) علاقائی، سماجی، معاشی اور رسوماتی اکائی کے لحاظ سے گاؤں ایک علاحدہ اور نمایاں وجود رکھتا ہے۔ ایسے مقام کے باشندے اپنی جماعتی وحدانیت کا احساس رکھتے ہیں اور دوسرے بھی اسے مانتے ہیں۔ ان میں اپنی بستی سے ایک طرح کا جذباتی لگاؤ پایا جانا غیر معمولی نہیں۔ بہت سے معاملات میں گاؤں متحد الخیال ہوتا ہے۔

(2) ان بستیوں کی آبادی ملی جلی ہوتی ہے جس میں مختلف ذات کے ہندو قبیلے اور دوسرے مذاہب کے گروہ شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہندو آبادی کا تعلق ہے ان کے مختلف گروہ سماجی، معاشی اور رسوماتی حیثیت سے جماعت کی تنظیمی تشکیل میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ کوئی ذات علاحدہ طور پر خود مکتفی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کو بہت سی ایسی دیگر پیشہ ور ذاتوں کی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے جو خاص خاص پیشوں اور حرفوں کی اجارہ دار ہوتی ہیں۔ محنت کی امداد باہمی کا یہ مسلمہ طریقہ بین ذاتی تعلقات پر مبنی ہے اور اسے رواجاً تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ صرف معاشی جدوجہد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ تقریبات اور عبادات میں بھی عام ہے۔ دیہی ہندستان کی سماجی ساخت کی اقتداری تنظیم ذات پات کی وجہ سے کچھ ایسی ہے کہ اس میں قبائلی اور غیر ہندو طبقے (مثلاً مسلمان اور عیسائی) کی حیثیت بھی دوسری ذاتوں کے مماثل ہوتی ہے۔ ہندستان کے بہت سے حصوں نے اپنی سماجی اور مذہبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ذات پات کی بعض خصوصیات مثلاً پیشہ ورانہ مہارت کو اختیار کر لیا ہے۔ ہندستان کے چند دیہی علاقوں میں مسلمان بھی پیشہ ور ذاتوں کی طرح کئی قسم کے کام کرتے ہیں، مثلاً آتشبازی بنانا، کپڑا بننا، تانگہ، یکہ اور کرایے کی گاڑیاں چلانا، ترکاریاں بیچنا یا گانا بجانا وغیرہ۔

(3) مقامی گروہ کے لوگ باہمی رشتوں میں مشترکہ ذمے داریوں کے بندھن میں بندھے ہوتے ہیں۔ دیہی کاروبار کے اکثر شعبوں میں بین شخصی اور بین گروہی تعلقات کا انحصار عام رواج اور سماجی اخلاق پر ہوتا ہے۔ کمیونٹی کے اقدار اور اس کے مسلمہ رواج کی خلاف ورزیوں کا تصفیہ گاؤں کے بڑے لوگوں یا گاؤں کی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گاؤں کی مجلس گاؤں کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے سماجی طور پر بائیکاٹ کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے فیصلوں کو موثر طور سے نافذ کر سکتی ہے۔

□□□

دیوانِ حسرت عظیم آبادی
مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی
حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان کا مکمل دیوان ہے جس پر فاضل مرتبہ نے تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے۔
(دوسرا ایڈیشن)
صفحات: 484 ، قیمت: 100

رباعیات انیس
مصنف: علی جواد زیدی
میر انیس کے مرثیوں کی طرح ان کی رباعیاں بھی بے مثال ہیں۔ اس کتاب میں انیس کی تمام دستیاب رباعیاں شامل ہیں جن کی تعداد لگ بھگ چھ سو ہے۔
(دوسرا ایڈیشن)
صفحات: 383 ، قیمت: 85

مثنوی بہرام و گل اندام
طبعی گولکنڈوی
طبعی گولکنڈوی دکنی اردو کے دبستانِ گولکنڈہ کا آخری روشن ستارا ہے۔ اس مثنوی میں اس کے شاعرانہ کمالات کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ تفصیلی مقدمے اور فرہنگ کے ساتھ
(پہلا ایڈیشن)
صفحات: 236 ، قیمت: 66

جوابات تاریخ کوئز (قدیم ہندستان):

1- ج 2- د 3- ب 4- ب 5- الف 6- الف 7- ج 8- ب 9- الف 10- ج 11- ج 12- ب
13- د 14- ج 15- ب 16- ج 17- د 18- الف 19- ج 20- ج 21- ب 22- ب 23- ج 24- ج
25- ب 26- ب 27- ب 28- ب 29- الف 30- ب 31- ج 32- د 33- ب 34- ب 35- الف 36- الف
37- الف 38- الف 39- ب 40- ب 41- ب 42- الف 43- ج 44- الف 45- الف 46- ج 47- الف 48- د
49- د 50- الف

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد جلد اوّل سے اقتباس

میاں آزاد مترجم

اس شہر مبارک بنیاد سے چلے تو ایک نئے مقام پر پہنچے۔ اب سنیے! کڑکڑاتی دھوپ پڑ رہی ہے۔ کھوپڑی چٹخی جاتی ہے۔ ٹھیک دوپہر چیل انڈے پر انڈا چھوڑ رہی ہے۔ لو کے تھپیڑے وہ زناٹے کے چل رہے ہیں کہ الاماں! دانہ زمین پر گرتا تو بھُن جاتا۔ چو طرفہ سناٹا، ہُو کا عالم۔ پرند اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے دبکائے۔ حضرت انساں مکانوں میں جان بچائے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت آگئی، آفتاب سوا نیزہ پر ہو رہا۔ مگر واہ رے میرے شیر کیا کہنا۔ میاں آزاد گلی کوچوں میں چکر لگانے سے کب بند۔ گو:

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

لیکن میاں آزاد بے غل و غش شہر کے صدقے ہو رہے تھے۔ آخر کار پھرتے پھراتے، چلتے چلاتے، ایک جوہری کے دکانچہ زرنگار کی طرف سے جو گزرے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کمسن لڑکا جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ میاں آزاد گھومتے گھومتے جہاں دیدہ ہو گئے تھے۔ چتونوں سے تاڑ گئے کہ یہ جوہری بچہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لفافہ دور سے دیکھتے ہی خط کا مضمون بھانپ لیا۔ سوچے کہ اس سے کسی طرح ملیں۔ مگر جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔ ملاقات کے لیے کچھ تو تقریب چاہیے۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پوچھا، "کیوں صاحبزادے اس گاؤں کا کیا نام ہے۔"

جوہری بچہ: گاؤں یہاں سے کوئی دس بارہ گولی کے ٹپے پر ہے۔ گاؤں کہیں اور ہو گا۔ گاؤں کی ایک ہی کہی۔ یہ شہر ہے یا گاؤں؟

آزاد: ہاں وہی شہر۔ لاحول۔ کیوں میاں یہاں میٹھا حلوا بھی بکتا ہے؟

جوہری بچہ: (مسکرا کر) اور کیا آپ کے گاؤں میں کھٹا حلوا بھی بنتا ہے کیا؟ کریلے کا حلوا بناتے ہیں یا نیم کا؟

آزاد: میاں میں مسافر غریب الوطن ہوں سرا کا پتا بتا دیجیے تو احسان ہو گا۔

جوہری بچہ: پورب کی طرف ناک کی سیدھ پر چلے جاؤ۔ بائیں ہاتھ کو راستہ گیا ہے۔ دس ہی قدم پر چوراہا ہے۔ بس سامنے سرا کا پھاٹک نظر آتا ہے۔ یہاں آپ کا کس غرض سے آنا ہوا۔ کسی بھٹیاری سے رشتے داری ہے؟

آزاد: کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ ہم پر فقرے بازیاں۔ اے تیری قدرت آپ بھی اتنے ہوئے، خدا رکھے میاں صاحبزادے! ابھی تم خدا اٹھارہ برس کا سن ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ کل ہوش سنبھالا، آج ہم پر منہ آنے لگے۔ سنیے! بندہ نواز، ہم یہاں مسافرانہ طور پر آئے ہیں۔ اگر ترجمہ د ترجمہ کہیں ملے گا تو فہوالمراد، ورنہ چلتا دھندا۔ سو اگر آپ کے امکان میں ہو تو آپ ہی ترجمہ دلوا دیں، چہارم آپ کی بھی نذر ہے۔

کوشش کرد کار خیر ہے یہ

جوہری بچہ: واہ وا۔ ازیں چہ بہتر، نیکی اور پوچھ پوچھ، مگر ترجمہ ایسا نہ ہو کہ لوٹیا فرستاد و دھوتی رسید، اور نہ ایسا کہ لکھے موسیٰ پڑھے خدا۔

آزاد: جی ایسا ترجمہ کروں کہ آنکھیں کھل جائیں۔ ہم کیا کو دوں دے کر پڑھے ہیں۔ خط دیکھیے موتی پروتا ہوں۔

جوہری بچہ: اچھا تو ہماری عرضی کا ترجمہ کر دیجیے، چونی نذر کروں گا۔ ابھی ابھی دوں گا۔ کھری مزدوری چوکھا کام۔

آزاد: چونی میں تو ایسے مترجم بہت مل جائیں گے۔ اچھا آپ لائیں تو سہی صبح صبح بوہنی سہی۔

جوہری بچہ: اچھا جی۔ ابھی آپ کے نزدیک تڑکا ہی ہے۔ تو بس معاف کیجیے۔ دوپہر ڈھل گئی۔ آپ کے یہاں ابھی پو پھٹنے ہی کا وقت ہے۔ دن دہاڑے یہ اندھیر تو ترجمہ کیا، بُرے کا سر کیجیے گا۔ بس قبلہ بس، خیر سن تو لیجیے۔

عرضی: کرم پرور، غریب گستر، نوشیر وان ثانی، عادل زمانی سلامت! فدوی کے چھنگی پونے ماشاءاللہ کھانچیوں بھرے ہیں۔ کوئی رتی بھر کا، کوئی ماشہ بھر کا، کوئی تولے بھر کا، کوئی چھٹنکی، کوئی پنسیری، دونی چونی، اٹھنی گنی، سب ہی رقم کے ہیں۔ میری مصیبت پر نظر ڈال کر کوئی عہدہ عطا فرمائیے، تو اس کے جلو میں خدا حضور کو فرانس کا پریسیڈنٹ کر دے! فدوی نے ایک کنڈے والے کی زبانی سنا ہے کہ آج کل دارو غگی بم پولیس بمشاہرۂ تیس روپیہ ماہواری خالی ہے۔ چونکہ کمترین کو صفائی کا بہت خیال ہے، لہٰذا اس استحقاق کے بموجب عرض رساں ہے کہ عہدۂ مذکور پاؤں۔ واجب تھا عرض کیا۔ فدوی۔

آزاد: سبحان اللہ، عرضی کیا لکھی ہے کہ قلم توڑ دیے۔ کیوں بھئی کتنی صاحبزادیاں اور صاحبزادے آپ کے ہوں گے؟ ہیں کوئی

آدھے درجن۔

جوہری بچہ: (ہنس کر) اجی یہاں تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی ہمارے چھوٹے بھائیوں تک کا بیاہ ہو گیا۔ چھما چھم کرتی بیویاں آئیں۔ مگر ہم ترس ہی رہے ہیں۔ لڑکے کیسے۔

آزاد: پھر یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ کھانچی بھر چینگی پوٹے ہیں۔

جوہری بچہ: اجی تو اب لکھنے سے بھی گئے گزرے۔ چور چوری سے گیا، ایرا پھیری سے بھی گیا؟ اب صاحب کو تو یہی پڑی ہے کہ تحقیقات کرتے پھریں، میر محلہ سے پوچھیں، تحصیلدار کے ذریعے سے دریافت کریں۔ اور تو کچھ انھیں کرنا ہی نہیں، آپ کی باتیں بھی واللہ لکھ رکھنے کے لائق ہیں۔

آزاد: عہدہ بھی چشم بد دور، وہ تجویز ہوا کہ زمانے بھر کا کوڑا۔ تڑکا ہوا اور بم پولیس جھانکنے لگے۔ کبھی بھنگیوں سے چخ چل رہی ہے، کبھی بھنگیوں سے گلخپ ہو رہی ہے۔ بھائی ابھی جوان ہو، پڑھو لکھو، جم کر محنت کرو۔ نوکری کی تمھیں کیا فکر ہے۔ لکھ پتی آدمی، جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ دکان جھک جھک کر رہی ہے اور چلے تیس روپیہ کی نوکری کرنے۔ اے لعنت خدا۔

جوہری بچہ: ہائیں، ہائیں کہاں تو عرضی لکھتے تھے کہاں لگے پانی پی پی کر کوسنے۔

آزاد: میاں پڑھنے لکھنے کا یہ ماحصل نہیں ہے کہ خواہ مخواہ نوکری ہی کرے۔ اور نہیں تو داروغہ بم پولیس ہی سہی۔ خاصے جوہری بنے ہو۔ صدہا آدمی لالہ جی لالہ جی کہتے ہیں۔ لالہ جی کے دماغ پر نوکری چڑھ گئی تو داروغہ بم پولیس بن بیٹھے۔ بات ترے کج خلقی کی ذوم میں نمدا۔ ایسے شوقِ ملازمت کی ایسی تیسی۔ خدانخواستہ ایسا کیا گاڑھا وقت ہے کہ پندرہ بیس کی نوکری پر جان دیتے ہو۔ یار عزیز! اپنی دکان کا کاروبار دیکھو، تیس روپیہ تو بات کی بات میں خیرات کر سکتے ہو۔

میاں آزاد وہاں سے اٹھے تو سوچے کہ بھئی شگون اچھا ہے۔ جھپ سر چوک ایک کمرہ کرایے پر لے مترجم بن بیٹھے اور دروازے پر ایک تختہ لگا دیا کہ "میاں آزاد مترجم"

اب دل لگی دیکھیے کہ صبح سے شام تک پچاسوں غرض مند آنے لگے۔ جسے دیکھو مصاحبت کرتا ہے۔ ایک لالہ صاحب قلمدان دبائے، عینک لگائے، تشریف لائے۔ آداب بجا لاتا ہوں کہہ کر دستی سے کاغذ نکالا۔

لالہ: بندہ پرور! اس عرضی کا ترجمہ کر دیجیے۔ جو کچھ ہو لیجیے۔

آزاد: آخاہ! یہ تو عرضی کیا امیر حمزہ کی داستان ہے۔ ذرا پڑھیے تو سہی۔

لالہ: حضور، پرنور دام۔ بعد آداب آداب بجا آوردہ معروق رائے فیض انجلائے گروا

پندہ می آید، کہ چوں فی زمانہ، بفضل قادر یگانہ، عہدہ ہائے چند در چند بہ وجوہ انتزام و دریا بردنی، و دریابر آمدنی خلو ے خواہد شد اور فدوی جاں نثار کئی ماہ سے سحر اور مساوظیفہ ترقی آپ کا او پر زبان میمون کے لاتا ہے۔ لہٰذا تسدیا پرداز ہے کہ اگر عہدۂ تحصیلداری عطا ہو تو پرورش ہے۔ اور کمترین ماہ تین سے بندوبست میں محرر ہے۔ کمترین کے بڑے بھائی کی بیوی، یعنی کمترین کی پھوپھی جس سے مذاق کا رشتہ ہے، اس کے باپ کے پہلے خسر کا چچازاد بھائی، داروغہ نہر بمشاہرہ اسّی روپیہ ماہوار تھا۔ چوں کہ حکم ہے کہ عالی خانداناں کی پرورش ہو گی، لہٰذا اس استحاقیت پر ملحوذ رہے۔ اور بندہ آبکاری کے کام سے بخوبی واقف ہے۔ ازانجا کہ کار گزاراں کی پرورش، اوپر حاکمان کے کہ خداوند مجازی ان کو خواص دعواماں کہتے ہیں۔ اسی طرح لازم ہے، جس طرح مسلمان کو حج عتبات عالیات، اور ہم ہندوان کو تیرتھ (گنگوتری لہر ہمارے من بھائی) واجب ہے۔ اگر عہدۂ مسطورۂ بالا عطا ہو تو خدا حضور، اور حضور کے بال بچوں اور بابا لوگ، اور قبیلے کو الیاس کی عمر دے۔ الٰہی دولت کا ستارہ بلند رہے! فدوی۔

میاں آزاد نے جو یہ عرضی سنی تو لوٹنے لگے۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اس قدر ہنسے، اس قدر ہنسے کہ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ لالہ جی عقل کے ناخن لیجیے۔ ہوش کی دوا کیجیے۔ پیش پاافتادہ الفاظ کے املا میں تو ہزار جگہ آپ نے غلطی کی۔ معروض کو (معروق)، یہ نئی گڑھت کا لفظ ہے۔ انتظام کی خرابی (انتزام)، تصدیعہ کے عوض (تسدیا)، ملحوظ کی جگہ ملحوذ، ماشاءاللہ! اور یہ دریا بردنی اور برآمدنی کی ایک ہوئی۔ (بعد آداب آداب بجا آوردہ) سب سے افصح محاورہ ہے۔ عالی خاندان کے لیے (عالی خانداناں)۔ بہت ہی خاصے (استحاقیت) باب استحقاقیت سے ہے۔ اور واللہ (گنگا توری لہر ہمارے من بھائی۔ یہ تان تو ایسی اڑائی کہ صاحب بھی ریجھ جائیں گے۔ واہ استاد اچھے گر یاد ہیں۔ عالی خاندانی کا ثبوت بھی کتنا صاف ہے کہ حضرت کے بڑے بھائی کی بھاوج کے باپ کے پہلے خسر کے چچازاد بھائی اسی روپیہ مہینے کے نوکر تھے۔ اللہ اللہ اے حضرت آپ تو بڑے عالی خاندان نکلے اور یہ سمجھا دینا تو آپ پر قرضِ عین تھا کہ بھاوج سے آپ کو دل لگی کا رشتہ ہے۔ اس کے بغیر عرضی پھیکی رہتی۔ قبلہ! بندے سے اس کا ترجمہ نہ ہو سکے گا۔ ذری اتنا تو بتا دیجیے کہ آپ ہیں کون: ٹھاکر؟

لالہ: جی بندہ تو اگن ہوتری ہے۔

آزاد: اگن ہوتری! یعنی بھڑ بھونجے۔ یہ کہیے تو پھر آپ کی عالی خاندانی میں کیا شک ہے۔ میاں آدمیت سیکھو۔ سات کی محرری سے تحصیلداری کے طالب ہو۔ بھلا کوئی بات بھی ہے۔

میاں بھڑ بھونجے بڑبڑاتے ہوئے چلے کہ واہ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ نام بڑے درشن چھوٹے۔ مترجم بنے ہیں۔ بڑا سا تختہ دروازے پر لگا دیا اور موٹے حرفوں میں لکھ دیا کہ میاں آزاد مترجم۔

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس کالم

نیا تعلیمی سال اور کیریئر کا انتخاب

آج زمانہ انھی لوگوں کی قدر کرتا ہے جو معیاری اور امتیازی تعلیم اور ہنرمندی کے حامل ہیں۔ کسی بھی طالب علم کو کیریئر بنانے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہے، اس سوال پر غور کریں تو جواب یہی ہوگا کہ دسویں جماعت کے بعد کم از کم پانچ سال یا زیادہ سے زیادہ سات سال کی تعلیم، بھرپور محنت، مشقت، لگن، جستجو اور کڑی مساعی کے نتیجے میں حاصل کیریئر کے ثمرات سے تاحیات بہرہ ور ہوا جاسکتا ہے۔ اگر انسان کی اوسط عمر 60 ' 65 برس کے لگ بھگ مان لی جائے تو جس وقت دسویں جماعت میں طالب علم ہوگا اس وقت اس کی عمر پندرہ سال ہوگی اور اس میں حقیقی کیریئر کے مذکورہ زیادہ سے زیادہ سات سال شامل کر لیے جائیں تو بیس سال کی محنت کے ثمرات زندگی کے باقی 40'45 سال آرام و آسائش اور بے تک و دو، فائدے ہی فائدے میں گزارے جاسکتے ہیں۔ سات سال کا وقت و نقد (Time and Money)، کا انوسٹمنٹ اگلے چالیس سال اور اس سے زیادہ عرصے تک مسلسل شاندار ریٹرنس (Returns) رکھتا ہو تو آدمی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر ہر طالب علم کو اپنے کیریئر سنوارنے کے ان سات برسوں میں نہ تو اپنی دلچسپی بانٹنی چاہیے نہ اپنی توجہ۔ نہ کوئی غیر ضروری تفریح میں ذہن کو مشغول کرنا چاہیے، نہ اپنی لگن، جستجو اور شوق کو ڈھیلا چھوڑنا چاہیے۔ اپنے کیریئر کو محور بنا کر ذہن کو اسی پر بس گھومنے دینا چاہیے، اس وقت تک جب تک کہ کیریئر کا مطلوبہ کوہ نور حاصل نہیں ہو جاتا۔ ان سات برسوں کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے: دسویں جماعت کے بعد دو سال کی سینئر سکنڈری / ہائر سکنڈری / پی یو سی / انٹرمیڈیٹ یا بارھویں جماعت۔ اس کے بعد تین سال تک گریجویشن (بی اے، بی ایس سی اور بی کام) اور پھر سول سروس امتحانات (پریلیمنری، مین اور انٹرویو)—یعنی آئی اے ایس یا آئی پی ایس یا پھر کسی بھی قومی خدمت میں عالی شان روزگار حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یا دوسرا راستہ یہ ہوگا کہ دسویں کے بعد انٹرمیڈیٹ کے دو سال اور پھر انجینئرنگ کے چار سال یا ایم بی بی ایس، بی ڈی ایس وغیرہ کے پانچ چھ سال۔ اس کے بعد بحیثیت انجینئر یا بحیثیت ڈاکٹر کیریئر کی منزل پر بااطمینان متمکن ہوا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ بحیثیت طالب علم کیا ہم صرف پانچ سال یا صرف سات سال اپنی کیریئر سازی میں سنجیدگی سے نہیں لگا سکتے؟ ان برسوں میں ایسی دھن سوار کر لیجیے کہ پھر کوئی تفریح آپ کی حدود میں داخل نہ ہو سکے، آپ کو بھٹکا نہ سکے، کوئی دوسرا خیال، کوئی دوسری دلچسپی اور کوئی دوسری کشش للچا نہ سکے۔ یہ ضبط، یہ قوتِ ارادی، یہ اٹوٹ لگن آپ کو یقیناً ایسی منزل تک لے جاسکتی ہے جو آپ کے اپنے لیے، آپ کے گھر اور خاندان کے لیے اور اس طرح بحیثیت مجموعی قوم کے لیے باعثِ فخر ہوگی۔

آپ اب اس بات کا جائزہ لیں کہ کس طرح کے مواقع ہمارے لیے مہیا ہیں اور ہم اپنی پسند، اپنے وسائل، مالی موقف، سماجی صورتِ حال اور سہولیات کے پیشِ نظر کن مواقع کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

دسویں جماعت میں کامیابی کے بعد طالب علم آگے کیریئر کے مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ پہلے ہم پیشے کا انتخاب کر لیں کہ ہمیں کیا بننا ہے۔ جب پیشے کا انتخاب ہو جاتا ہے تو پھر اس پیشے تک پہنچنے کا راستہ کیا ہوگا، اس کی تلاش بالکل آسان ہو جائے گی۔ اس راستے کی تلاش میں ایک اہم پڑاؤ انٹرمیڈیٹ / ہائر سکنڈری یا 2+ کا ہے۔ اس میں سب سے اہم سبجیکٹ کا انتخاب ہے۔ ہم جس پیشے کا انتخاب کر چکے ہیں اسی کی مناسبت سے مضامین کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یا مضامین پر مبنی گروپ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر انجینئر بننے کا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے تو ہمیں دسویں جماعت کے بعد 2+ کرنا ہوگا اور اس میں فزکس، کیمسٹری اور ریاضی مضامین لینے ہوں گے۔ ان کے بغیر ہم انجینئر بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر ہم نے یہ طے کر لیا کہ ڈاکٹر بنیں گے تو ہمیں 2+ میں بیالوجی، فزکس اور کیمسٹری مضامین لینے ہوں گے۔ اس کے بغیر میڈیسن کا تصور ممکن نہیں۔

ہم یہاں ایسے ہی مضامین سے وابستہ کیریئر کا ذکر کر رہے ہیں، یعنی انٹر میں ہو یا گریجویشن سطح پر، کس مضمون سے کیریئر کی کتنی شاخیں نکلتی ہیں، ان کی تفصیل یہاں درج کی جارہی ہے۔ مضمون انگریزی اگر پڑھا ہو تو آگے جرنلزم، پبلشنگ، ماس کمیونیکیشن (ٹیلی ویژن اور فلم) ایڈورٹائزنگ اینڈ پبلک ریلیشنگ، فیشن، ایرلائنس، تدریس وغیرہ میں کیریئر بنایا جاسکتا ہے۔ تاریخ اگر پڑھی ہو تو سول سروس، آرکیالوجی، میوزیالوجی، آرٹ ریسٹوریشن، ٹریول اینڈ ٹورازم اور تدریس کر سکتے ہیں۔ اکنامکس اگر پڑھی ہو تو سول سروس بشمول انڈین اکنامک سروس، انڈین اسٹے ٹسٹکل سروس، مینجمنٹ، فنانس، بینکنگ، چارٹرڈ اکاؤنٹینسی، کمپنی سکریٹری، کاسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹنسی، چارٹرڈ فنانشیل

انالسٹ، فارن ٹریڈ، لا، پلاننگ، سوشل ڈیولپمنٹ، ایڈورٹائزنگ اور تدریس کرسکتے ہیں۔ سوشیالوجی مضمون پڑھا ہو تو سوشل ورک، مینجمنٹ، اسپیشل ایجوکیشن، سول سروس، تدریس اور ریسرچ کرسکتے ہیں۔ سائیکلوجی پڑھی ہو تو کونسلنگ، مینجمنٹ، اسپیشل ایجوکیشن، سوشل ورک، تدریس، ریسرچ، تعلقات عامہ اور ماس کمیونیکیشن وغیرہ کرسکتے ہیں۔ جیوگرافی پڑھی ہو تو سول سروس، جیوگرافیکل ڈیموگرافک سروے آرگنائزیشن، جیولوجی، میٹرولوجی اور تدریس وغیرہ کرسکتے ہیں۔ پولٹیکل سائنس پڑھا ہو تو سول سروس، سیاسیات، لا، جرنلزم، سوشل ورک اور تدریس وغیرہ کرسکتے ہیں۔ آرٹس اور ہیومانٹیز (جنرل) مضامین پڑھتے ہوئے طلبہ، پرفارمنگ آرٹس، لائبریری سائنس، تدریس، بزنس مینجمنٹ، ہوٹل مینجمنٹ، فزیکل ایجوکیشن، ایرلائنس، سکریٹریل ورک، ماس کمیونیکیشن، پبلشنگ، پرنٹنگ، پبلک ریلیشنز میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔ کامرس پڑھتے ہوئے طلبہ بزنس مینجمنٹ، بینکنگ، چارٹرڈ اکاؤنٹینسی، کاسٹ اکاؤنٹینسی، کمپنی سکریٹری، ایکچوریل سائنس، اسٹیٹسٹکس، آپریشنل ریسرچ، مارکیٹ ریسرچ، اکنامکس، فارن ٹریڈ، لا، ایڈورٹائزنگ، سول سروس، انڈین اکنامک سروس، انڈین اسٹیٹسٹکل سروس، ریونیو سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ، ریلوے، ڈیفنس کاونٹ سروس وغیرہ میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔ کامرس جنرل کیے ہوئے طلبہ لائبریری سائنس، ہوٹل مینجمنٹ، سکریٹریل ورک، جرنلزم، تدریس، پبلک ریلیشنز، پبلشنگ وغیرہ میں جاسکتے ہیں۔

ان کے علاوہ تین مضامین پر مبنی درج ذیل گروپ کے طلبہ کے لیے بھی کئی الگ الگ مواقع مہیا ہیں۔ فزکس، کیمسٹری اور ریاضی (P.C.M.) کیے ہوئے طلبہ انجینئرنگ، کمپیوٹرس، آرکیٹکچر، بلڈنگ کنسٹرکشن، سول ایویشن، پائلٹ، آرمی، نیوی، ایرفورس، پیراملٹری سروس، مرچنٹ نیوی، فارمیسی، اگریکلچر، فوڈ پروسسنگ، لیدر ٹیکنالوجی، فٹ ویئر ٹیکنالوجی، پیکیجنگ ٹیکنالوجی، پلاسٹک ٹیکنالوجی، پرنٹنگ ٹیکنالوجی، جیمس اینڈ جیولری، میٹرالوجی، اوشیوگرافی، مائننگ اینڈ میٹلرجی، اسٹروفزکس، اسٹرانومی، ریسرچ اور تدریس وغیرہ میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی / زولوجی کیے ہوئے طلبہ میڈیسن، ڈنٹسٹری، پیرامیڈیکل سروس، نرسنگ، ٹریڈیشنل میڈیسن، وٹرنری سائنس، بائیوٹیکنکس، جینٹکس، میکروبیالوجی، میرین بائیولوجی، ہوم سائنس، فوڈ پروسسنگ، نیوٹریشن اینڈ ڈائیٹیکس، اگریکلچر، ڈیری فارمنگ، پولٹری فارمنگ، ہارٹی کلچر اینڈ فاریکلچر، ایکواکلچر، انتھروپولوجی، انوائرنمنٹل سائنس، فارسٹری، ٹی انڈسٹری، ریسرچ اور تدریس وغیرہ میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔

فزکس، کیمسٹری اینڈ کمپیوٹرس کیے ہوئے طلبہ انفارمیشن ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اپلی کیشن، ملٹی میڈیا، انجینئرنگ، ڈیزائن گرافک اور تدریس وغیرہ میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔ فزکس، کیمسٹری اور ٹیکنیکل ڈرائنگ کیے ہوئے طلبہ آرکیٹکچر، بلڈنگ اینڈ کنسٹرکشن انجینئرنگ، ڈیزائن اور تدریس کے کورس کرسکتے ہیں۔ جنرل سائنس پڑھے ہوئے طلبہ آرمڈ فورسس، آرمی، نیوی اور ایرفورس، مرچنٹ نیوی، پیراملٹری سروس، فارسٹ سروس، سول ایویشن، پائلٹ، بینکنگ، سول سروس اور بزنس مینجمنٹ وغیرہ میں کیریئر بنا سکتے ہیں۔

بیرونی ممالک کے میڈیکل کورس میں داخلے کی شرائط

بیشتر طلبہ بیرونی ممالک کے میڈیکل کورس میں داخلے کے خواہشمند رہتے ہیں اور داخلہ حاصل کرلیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان دنوں ملک میں میڈیکل داخلوں کی کڑی مسابقت نے طلبہ کو نقلِ مقام کے لیے مجبور کردیا ہے اور دوسری طرف بیرونی ممالک کے اداروں اور جامعات نے اپنے کورسوں کی انڈین مارکیٹ میں فروخت کا اچھا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایسے ماحول میں میڈیکل کونسل آف انڈیا نے بعض رہنما خطوط جاری کیے ہیں۔ کسی بھی ایسے کورس میں داخلے سے قبل Eligibility Certificate حاصل کریں۔ مزید اور مکمل تفصیلات کونسل کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

Secretary, Medical Council of India,
Aiwan-e-Ghalib Marg, Kotla Road,
New Delhi-1100 02.

امریکی ویزا کے حصول کا نیا طریقہ

امریکہ کے ویزا کے حصول کے لیے امیدواروں کو اب ایمبسی کے چکر کاٹنے نہیں پڑیں گے اور نہ ہی رات بھر سے لمبی قطاروں میں کھڑا رہنا پڑے گا۔ اب آپ بہت آسانی کے ساتھ گھر بیٹھے وقت طے کریں اور دیے گئے وقت پر انٹرویو میں شرکت کریں۔ وقت کا تعین آپ کے اور ایمبسی کے لیے سہولت بخش طریقے پر کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ ویب سائٹ پر لاگ آن کریں اور آن لائن Appointment حاصل کرلیں۔

www.ttsvisas.com
Offices:CHENNAI:T.T. Service, N.o-10
Venus Colony, Sriman Srinivasa Cross Road
Alwarpet, Chennai-600018 Tel:044-4357145
(2) Bangalore: 218, Raheja Chambers
12, Museum Road, Bangalore-560 001
Tel: 080-5550111/2
(3) Hyderabad: No. 5-10-188/2
Summit Building, Hillfort Road
Hyderabad-500004- Tel: 040-3231615

□□□

161, SPI, C, CIB Quarters, Nehru Nagar,
Kachiguda, Hyderabad-27

عظیم صدیقی کمپیوٹر کالم

مائکروسافٹ ورڈ

متن کی تزئین کاری (Formating of Text)

- متن (Text) کو مزید دلکش بنانے کے لیے کئی طرح کی تبدیلیاں (Formating) کی جاسکتی ہیں۔ اس میں متن تو وہی رہے گا جو آپ نے ٹائپ کیا ہے لیکن اس کی ظاہری شکل وصورت میں کئی خوش آئند تبدیلیاں آجائیں گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی ایکٹر کو کئی طرح کے میک اَپ کرا کے مختلف رول کی ادائیگی کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔
- اس سے پہلے کہ ہیئت سازی کی ہدایتیں دی جائیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ چند بنیادی باتیں اس ضمن میں اچھی طرح ذہن نشیں کرلیں۔ مثلاً خط (Font) کیا ہوتا ہے، یہ کتنے طرزوں (Style) میں لکھا جاسکتا ہے، اس کے ناپ (Size) کا پیمانہ کیا ہوتا ہے اور اس میں کیا کیفیات (Effects) پیدا کی جاسکتی ہیں؟

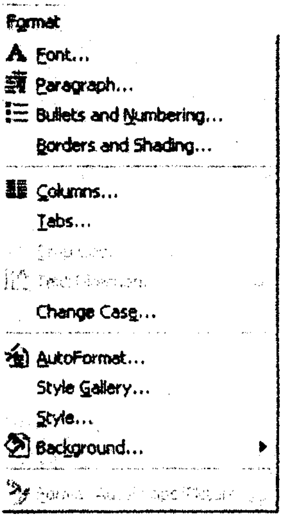

- لوحِ آلات پر جب بھی آپ تزئین کاری (Format) پر کلک کرتے ہیں تو یہ فہرست (Menu) نکل کر آتی ہے۔ اس میں تزئین کاری (Formating) کے تمام آلات موجود ہیں۔
- ...Font رسم الخط کی تبدیلیوں میں مدد کرتا ہے تو ...Paragraph پیراگراف کی تبدیلیوں میں۔ اسی طرح متن کو کالم میں تبدیل کرنا، اس کی چوڑائی، پیرے کے آغاز میں حرفِ مطلع لانا، اس کی سمت مقرر کرنا اور رسم الخط میں تبدیلیاں لانا وغیرہ وہ پہلو ہیں جن کو ایک ایک کرکے بیان کیا جائے گا۔
- فی الحال A Font پر کلک کریں گے تو ایک استفساریہ نکل کر آئے گا جو اگلے صفحے پر ملاحظہ کریں۔

تزئین کاری (Formating) کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس عبارت کی تزئین کاری کرنا مقصود ہو، اس عبارت کو منتخب (Select) کرلیں۔

- اس سے پہلے کہ آپ تزئین کاری پر توجہ دیں، ان ارکان کو اچھی طرح سمجھ لیں جو تزئین کاری کرتے ہیں۔ اس استفساریے میں چھ جگہیں ایسی ہیں جہاں کرسر سے ٹائپ کیا جاسکتا ہے۔ جیسے Font, Size, Font Style, Underline Style, Font color and effects, Underline color وغیرہ۔
- نیچے جہاں Times New Roman لکھا ہے وہ ایک نمائشی دریچہ ہے جہاں آپ ہر وہ تبدیلی ملاحظہ کرسکیں گے جو آپ نے متن میں کی۔ اس کے علاوہ اس کے پیچھے دو استفساریے (Character Spacing & Text Effects) بھی پنہاں ہیں۔

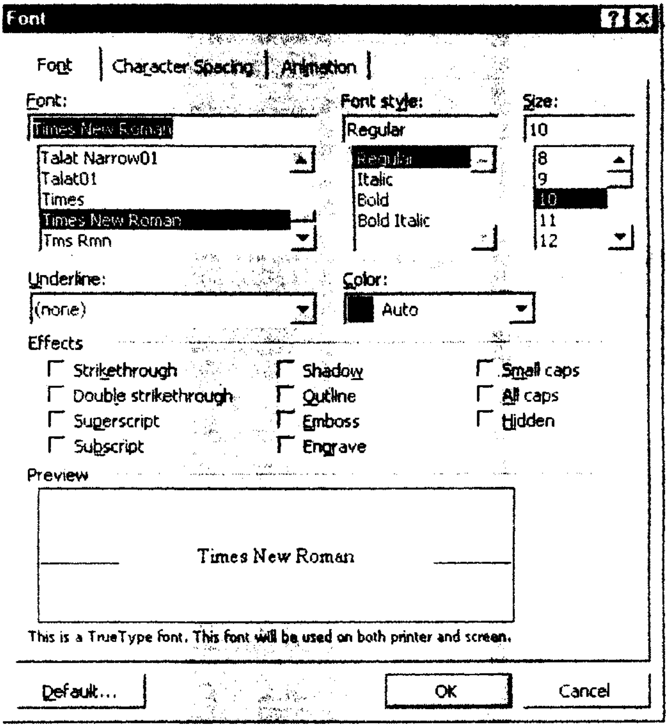

- یہ دریچہ ان تمام ارکان کا ایک مظہر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا متن اس وقت Times New Roman نامی رسم الخط (Font) میں، Normal طرزِ تحریر میں، 12 Points کے سائز میں، Autocolor یعنی کالے رنگ میں بغیر کسی کیفیت (Effect) اور خطِ کشیدہ (Under line) کے موجود ہے۔

تزئین کاری کے آلات (Formating Tool)

خط کشیدہ طرز (Underline Style)

- کبھی کبھی کسی فقرے کو نمایاں کرنے کے لیے اس کو خط کشیدہ کرنا پڑتا ہے۔ ابھی اس پر None لکھا ہے، لیکن تیر کے نشان پر کلک کرنے سے کئی طرز کے خطوط نکل آئیں گے۔ اس کو فقرے پر ڈالنے کے لیے اس فقرے کو منتخب کر لیں پھر جو طرز پسند ہو اس پر کلک کریں، وہ خط آپ کے فقرے کے نیچے آجائے گا۔ اس کا رنگ بھی دوسرے خانے Underline Color میں جا کر بدلا جا سکتا ہے۔

طرزِ خط (Fonts)

- ہر زبان کا اپنا ایک رسم الخط ہوتا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ مختلف ذیلی خطوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انگریزی زبان میں یہ کافی تعداد میں بنا لیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ چار یا پانچ بنیادی خطوط کی ہی مختلف اشکال ہیں۔ نمونے کے طور پر کچھ ذیلی خطوط سامنے 14 Points سائز میں دکھائے گئے ہیں۔ خط کا نام بھی سامنے موجود ہے۔

Various Fonts Designs in 14 Points

A quick brown fox	Arial
A quick brown fox	**Arial Black**
A quick brown fox	Arial Narrow
A quick brown fox	Times New Roman
A quick brown fox	Bookman Old
A quick brown fox	***Comic Sans MS***
A quick brown fox	Courier New
A quick brown fox	**Impact**
A quick brown fox	Lucida Console
A quick brown fox	Garamond

- یہاں پوری فہرستِ خطوط دینا ممکن نہیں۔ آپ خود ان کو Fonts کی فہرست میں دیکھ سکتے ہیں۔
- متن میں طرزِ خطوط کا استعمال آپ کے ذوق اور موقع محل پر منحصر ہے۔

طرزِ تحریر (Font Style)

- Normal ایک عام طرزِ تحریر کو کہتے ہیں۔ A quick brown fox اس کی مثال ہے۔
- ٹیڑھے یا کج خط کو Italics کہتے ہیں۔ *A quick brown fox* اس کی مثال ہے۔
- عام طرزِ تحریر سے دبلے یا سکڑے خط کو Thin/ Narrow کہتے ہیں۔ A quick brown fox اس کی مثال ہے۔
- جلی یا موٹے خط کو Bold/ Black کہتے ہیں۔ **A quick brown fox** اس کی مثال ہے۔

خط کا پیمانہ (Font Size)

- کسی بھی خط کی اونچائی نقطوں (Points) میں ناپی جاتی ہے۔ یہ ایک انچ میں بہتر 1" = 72 Points ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ملی میٹر میں بھی ناپی جاتی ہے۔ خط کی اونچائی کا اندازہ نیچے دی گئی مثال سے ہو سکتا ہے۔

A quick brown fox jumped over the lazy dog .... 12 POINTS

A quick brown fox jumped over the lazy dog .... 14 POINTS

A quick brown fox jumped over the lazy dog .... 18 POINTS

A quick brown fox jumped .... 24 POINTS

A quick brown fox jumped .... 36 POINTS

A quick brown fox .... 48 POINTS

رنگِ تحریر

- گو کہ اس وقت آپ کے خط کا رنگ خود کار (Automatic) یعنی کالا ہے۔ لیکن اس کا رنگ بدلا جا سکتا ہے۔ اس کے پیکان پر کلک کیجیے، کئی رنگ دکھائی دیں گے۔ جس رنگ پر کلک کریں گے وہی رنگ آپ کے متن کا ہو جائے گا۔

کیفیات (Effects)

- آپ اپنے منتخب شدہ جملے یا متن کو بائیں جانب دکھائی گئی کسی بھی کیفیت سے مزیّن کر سکتے ہیں۔ آپ جس خانے میں کلک کریں گے وہی کیفیت آپ کے متن پر نمائشی دریچے میں دکھائی دے گی۔ O K کرنے پر یہی کیفیت متن پر طاری ہو جائے گی۔
- Super/ Sub Script میں صرف اسی حرف کا انتخاب کیا کیجیے جس پر اس کیفیت کا اطلاق کرنا ہے۔

Strike Through	~~A quick brown~~
Double Strike	~~A quick brown~~
Super Script	A quick ^{brown} fox
	$(a + b)^2 = a^2 + 2ab + b^2$
Sub-Script	$3H_2SO_4 + 3Al = 3Al\ SO_4 + 3H_2$
Shaded	A quick brown
Outline	**A quick brown**
Embossed	
Engraved	
Small Caps	A QUICK BROWN
All Caps	A QUICK BROWN
Hidden	

دوسرے متبادلات کا استعمال (Use of other Options)

- اس استفساریے میں مزید دو استفساریے پنہاں ہیں، جو ان پر کلک کرنے پر ابھر آتے ہیں۔

یہ بین الحروف (Character Spacing) اور کیفیتِ متن (Text Effects) کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

خلا بین الحروف (Character Spacing)

- انگریزی میں کئی سالم سالم حروفِ تہجی مل کر ایک لفظ بناتے ہیں۔ ان حروفِ تہجی کے بیچ کے فاصلے میں ردوبدل کر کے کچھ کیفیات پیدا کی جا سکتی ہیں۔
- اس کو بھی عبارت منتخب کر کے اور بعد ازاں متبادل پر کلک کر کے کیا جا سکتا ہے جو متعلقہ پیکان پر کلک کرنے سے وارد ہو گا۔
- O K پر کلک کرنے پر ہی اس کا اطلاق آپ کے متن پر ہو گا۔

جسامت فی صد (Body per cent)

- اس میں حرف کی چوڑائی کو کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیفیت متن کو منتخب کر کے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سے مطلوبہ جگہ کو عبارت سے بھرا جا سکتا ہے۔
- یہ Character Spacing پر کلک کرنے سے نکلتا ہے۔ اس میں کئی متبادلات شامل ہیں۔

(جاری)

محمد اخلاق آزاد کوئز

قدیم ہندستان

(1) وادیِ سندھ تہذیب (Indus Valley Civilization) کا سب سے مناسب نام ہے۔
(الف) وادیِ سندھ تہذیب (ب) سندھ تہذیب
(ج) ہڑپا تہذیب (د) مندرجہ بالا سبھی

(2) موہن جوداڑو کے حمام میں پانی کہاں سے آتا تھا؟
(الف) نہر (ب) جھیل
(ج) تالاب (د) کنواں

(3) کس عہد کے لوگ لوہے کے استعمال سے ناواقف تھے؟
(الف) ویدک (ب) ہڑپا
(ج) موریہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(4) "سندھ کا باغ" یا "مردوں کا ٹیلا" کہا جاتا ہے؟
(الف) ہڑپا (ب) موہن جوداڑو
(ج) کالی بنگن (د) لوتھل

(5) زمانۂ قدیم کے لوگوں نے سب سے پہلے کیا سیکھا؟
(الف) آگ جلانا (ب) جانور پالنا
(ج) پہیہ بنانا (د) اناج اگانا

(6) بنی نوعِ انسان نے سب سے پہلے کون سی فصل پیدا کی؟
(الف) گیہوں اور جو (ب) چاول
(ج) باجرہ (د) مکئی

(7) "کپاس" کا استعمال سب سے پہلے کس نے کیا؟
(الف) مصر نے (ب) میسوپوٹامیا نے
(ج) سندھ نے (د) چین نے

(8) ہندستان میں زراعت کے سب سے قدیم نشان کہاں ملے ہیں؟
(الف) ہڑپا (ب) مہرگڈھ
(ج) سرائے نہر (د) برجھوم

(9) وادیِ سندھ تہذیب کے لوگ کس کی عبادت کرتے تھے؟
(الف) پشوپتی (ب) اندر اور ورون
(ج) برہما (د) وشنو

(10) وادیِ سندھ کے لوگ کس دھات سے ناواقف تھے؟
(الف) ٹین (ب) تانبا
(ج) لوہا (د) شیشہ

(11) موہن جوداڑو کی سب سے بڑی عمارت ہے:
(الف) حمام (ب) اینٹ سے بنا مکان
(ج) اناج کا گودام (د) ان میں سے کوئی نہیں

(12) ہڑپا تہذیب کی کھوج کس نے کی؟
(الف) گوپال مجومدار (ب) مادھو سروپ و دیارام ساہنی
(ج) فضل احمد اور اریل اسٹائل (د) برجوای ال

(13) پتھر کے ابتدائی دور (Paleolithic Age) کے لوگوں کا خاص پیشہ تھا:
(الف) زراعت (ب) جانور پالنا
(ج) مچھلی پکڑنا (د) شکار اور غذا جمع کرنا

(14) ہڑپا تہذیب کے سکّے بنے ہوتے تھے:
(الف) تانبے کے (ب) سونے کے
(ج) مٹی کے (د) کانسے کے

(15) پتھر کے وسطی دور (Mesolithic Age) کے لوگوں نے استعمال کیے:
(الف) تانبے کے اوزار (ب) پتھر کے اوزار
(ج) لوہے کے اوزار (د) لکڑی کے اوزار

(16) ہڑپا تہذیب کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا تھی؟
(الف) حمام (ب) عبادت گاہ
(ج) شہری منصوبہ بندی (د) اناج گودام

(17) پُرانوں کی تعداد ہے:
(الف) پندرہ (ب) گیارہ
(ج) سترہ (د) اٹھارہ

(18) وادیِ سندھ کے لوگ کس جانور کا بڑا احترام کرتے تھے؟
(الف) سانڈ (ب) گوریلا

(ج) گائے (د) عقاب

(19) رگ وید میں درج سب سے اہم ندی کون سی ہے؟

(الف) گنگا (ب) سرسوتی

(ج) سندھ (د) جمنا

(20) رگ وید آریان کی زبان کیا تھی؟

(الف) دراوڑ (ب) پراکرت

(ج) سنسکرت (د) پالی

(21) رگ ویدک خاندان ہوتا تھا:

(الف) مادر شاہی (ب) پدر شاہی

(ج) دونوں (د) صرف الف

(22) آریہ کے لفظی معنی ہیں:

(الف) بہادر (ب) عالی نسب

(ج) عام (د) یکیہ کرنے والا

(23) ویدک عہد کے لوگوں نے سب سے پہلے کس دھات کا استعمال کیا؟

(الف) لوہا (ب) چاندی

(ج) تانبا (د) سونا

(24) کس وید کو نظم و نثر دونوں میں لکھا گیا ہے؟

(الف) رگ وید (ب) سام وید

(ج) یجر وید (د) اتھرووید

(25) آریہ کہاں کے باشندے تھے؟

(الف) شمالی روس (ب) وسط ایشیا

(ج) ہندستان (د) وسط ایشیا کا پامیر علاقہ

(26) گوتر (کل) رواج میں آیا:

(الف) رگ ویدک عہد میں (ب) آخری ویدک عہد میں

(ج) سندھ عہد میں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(27) برہمن گرنتھوں میں سب سے قدیم گرنتھ کون ہے؟

(الف) ایتریو برہمن (ب) شتپتھ برہمن

(ج) گوپتھ برہمن (د) پنچویش برہمن

(28) شک سمبت کی شروعات کس نے کی؟

(الف) اشوک (ب) کنیشکا

(ج) چندرگپت (د) ہرشوردھن

(29) میگستھنیز کس کا سفیر تھا؟

(الف) سیلوکس (ب) سکندر

(ج) داریوس (د) یونانیان

(30) سریمد بھگوت گیتا کے مصنف کون ہیں؟

(الف) کرشن (ب) مہارشی ویدویاس

(ج) سنکرس (د) وشوامتر

(31) اجنتا مصوری (Painting) کس کی داستان بیان کرتی ہے:

(الف) رامائن (ب) مہابھارت

(ج) جاتک (د) پنچ تنتر

(32) کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کا موضوع کیا ہے؟

(الف) اقتصاد (ب) خارجی پالیسی

(ج) مذہب (د) قانون

(33) میگستھنیز کس کے عہد میں ہندستان آیا؟

(الف) چندرگپت دوم (ب) چندرگپت موریہ

(ج) اشوک (د) ہرش

(34) "الورا" کا مشہور "کیلاش مندر" کس خاندان نے بنوایا تھا؟

(الف) گپت خاندان (ب) راشٹر کوٹ

(ج) پلو (د) چول

(35) اشوک کے "دھم" کا مرکزی مفہوم تھا:

(الف) امن وامان (ب) بڑوں کی عزت

(ج) مذہبی رواداری (د) بادشاہ کی وفاداری

(36) "بھگودگیتا" اصلاً کس زبان میں تصنیف ہوئی ہے؟

(الف) سنسکرت (ب) پراکرت

(ج) پالی (د) اپ بھرنش

(37) "انڈیکا" کی تصنیف کس نے کی تھی؟

(الف) میگستھنیز (ب) فاہیان

(ج) سی یوکی (Siyuki) (د) چندرگپت

(38) ہڑپا کس ندی کے کنارے بسا ہوا ہے؟

(الف) راوی ندی (ب) عرب ساگر

(ج) سندھو ندی (د) گھاگھرا ندی

(39) قدیم ہندستان پر سب سے پہلے کس غیر ملکی قوم نے حملہ کیا؟

(الف) یونانیوں نے (ب) ایرانیوں نے

(ج) شکوں نے (د) کشانوں نے

(40) ہڑپا کا رسم خط ہے:

(الف) پڑھنے میں بہت آسان ہے (ب) ابھی تک پڑھا نہیں جاسکا

(ج) اوپر سے نیچے لکھا جاتا ہے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(41) کس شاہی خاندان نے ہندستان میں سب سے پہلے سونے کے سکے جاری کیے؟

(الف) موریہ نے (ب) ہندو یونان نے

(ج) گپتوں نے (د) کشانوں نے

(42) سکندر نے ہندستان پر حملہ کب کیا؟

(الف) 326ق م (ب) 326 عیسوی

(ج) 322ق م (د) 322 عیسوی

(43) اپنشد کا موضوع کیا ہے؟

(الف) مذہب (ب) یوگا

(ج) فلسفہ (د) قانون

(44) کس کتبے پر "ستی" کے نشان سب سے پہلے ملے ہیں؟

(الف) ایران کتبے پر (ب) اترامیر کتبے پر

(ج) چندراوالو کتبے پر (د) حلمیدی کتبے پر

(45) کلہن کی راج ترنگنی کا موضوع کیا ہے؟

(الف) تواریخ کشمیر

(ب) گیتوں کا مجموعہ

(ج) چندر گپت کے عہد کے بارے میں

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(46) کس اولیں انسانی بت کی ہندستان میں پرستش کی گئی؟

(الف) برہما (ب) وشنو

(ج) بدھ (د) شیو

(47) بان بھٹ کس کے دربار میں تھا؟

(الف) پلکیسن دوم (ب) ہرش وردھن

(ج) سمدر گپت (د) یشودرمن

(48) kس گپت عہد میں سب سے زیادہ تجارت کہاں پھیلی ہوئی تھی؟

(الف) جنوب و شمال (ب) چین

(ج) وسط ایشیا (د) سلطنت روم

(49) شک سمبت کی شروعات کب ہوئی؟

(الف) 58ق م (ب) 78ق م

(ج) 58 عیسوی (د) 78 عیسوی

(50) چندر گپت موریہ نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں کس مذہب کی تعلیم لی؟

(الف) جین مذہب (ب) بودھ مذہب

(ج) وشنو مذہب (د) شیو مذہب

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

□□□

"اردو دنیا" اور "فکر و تحقیق" کے سالانہ خریدار بنیں

"اردو دنیا" اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں سالانہ قیمت سو روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں:

(دہلی سے باہر کے لوگ 110 روپے کا چیک بھیجیں)

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **"فکر و تحقیق"** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت 100 روپے

بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں:

(دہلی سے باہر کے لوگ 110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066

اردو خبرنامہ

قطر کا ادبی ایوارڈ گوپی چند نارنگ کے لیے

●دوحہ قطر، 9/ مئی 2002۔ ساتویں مجلس فروغِ اردو ادب ایوارڈ کے لیے اردو کے ممتاز نقاد، محقق، مفکر اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا انتخاب کیا گیا۔ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغے اور سپاس نامے پر مشتمل ہے جو ہر سال دوحہ قطر کی ایک شاندار تقریب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ ہندستان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا، اور پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور بانو قدسیہ کو پیش کیا جاچکا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام کا اعلان پینل آف ججز نے کیا جس کے چیئرمین پروفیسر شہریار اور اراکین جناب بلراج کومل، پروفیسر صادق اور پروفیسر صغریٰ مہدی تھے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی وقیع ادبی و علمی خدمات کے لیے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ پچاس سے زیادہ علمی کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں جن میں چالیس سے زائد اردو میں، سات انگریزی میں اور تین ہندی میں ہیں۔ تحقیق، تنقید، لسانیات تینوں میں وہ پایۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ کی کتابوں میں 'ادبی تنقید اور اسلوبیات'، 'قاری اساس تنقید'، 'ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'، 'امیر خسرو کا ہندوی کلام'، 'اسلوبیاتِ میر'، 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ'، 'اردو افسانہ روایت اور مسائل'، 'اقبال کا فن'، 'انیس شناسی'، 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اور 'اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

انھیں صدر جمہوریۂ ہند کی جانب سے "پدم شری" اور صدر پاکستان کی جانب سے طلائی تمغۂ امتیاز عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد علمی و ادبی اداروں نے انھیں اعزازات اور ایوارڈ دیے ہیں۔ وہ امریکہ کی وسکانسن یونی ورسٹی، ناروے کی اوسلو یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر اور اٹلی میں راک فیلر فیلو رہے ہیں۔ ہندستان میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونی ورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ پچھلے سال نیویارک، شکاگو، واشنگٹن اور ٹورانٹو میں جشنِ گوپی چند نارنگ منایا گیا۔ ان دنوں وہ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین ہیں۔

پاکستان میں یہ ایوارڈ اس سال شوکت صدیقی کو دیا گیا، جیوری کے چیئرمین مشتاق احمد یوسفی تھے۔ (ڈاک سے)

قلی قطب شاہ یادگاری خطبہ

●حیدرآباد، 18/ مارچ۔ "اردو زبان ہندستان میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی اور یہیں اس زبان نے ترقی کی ہے۔ میری دلی خواہش یہی ہے کہ کوئی اور ملک یہ نہ کہے کہ اردو اُن کے دیش کی زبان ہے۔" ان خیالات کا اظہار نامور سائنس داں پروفیسر اے۔ کے۔ بھٹناگر انچارج وائس چانسلر، سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد نے شعبۂ اردو سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد اور نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو، نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ محمد قلی قطب شاہ میموریل سالانہ خطبے کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ 18/ مارچ 2002 کو اردو ہال حمایت نگر میں منعقدہ اس جلسے میں اردو کے نامور محقق، نقاد اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اردو ہندی کے بنیاد گزار — امیر خسروؒ" کے عنوان سے اپنا خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو کا زمانہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے تین سو برس پہلے کا ہے۔ امیر خسرو 1252 میں پیدا ہوئے اور اُن کا انتقال 1325 میں ہوا۔ امیر خسرو کے جس کلام کو ہم قدیم اردو کہتے ہیں، اُس عہد میں جب کہ یہ کلام کہا گیا، ہندی کے نام کی کوئی زبان تھی۔ نہ کھڑی بولی، نہ برج نہ راجستھانی نہ ہی اودھی — صرف پراکرت تھی یا اپ بھرنش، جن کے اوّلیں نقوش بارھویں تیرھویں صدی میں مسلمانوں کے ہندستان میں قدم جمانے کے بعد سے ملتے ہیں۔ اسی ملی جلی زبان کو ریختہ کہا گیا۔ امیر خسرو نے بھی اس زبان کو ہندوی کے نام سے یاد کیا۔ امیر خسرو کے کلام کی حقیقت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کو جانچنے کی تین سطحیں ہوسکتی ہیں۔ (1) کلام کی تہذیبی اساس (2) اردو کا آغاز اور تاریخی ماخذ اور (3) کلام کی ادبی سطح — یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو زبان کی تہذیبی اساس پر سوالات اٹھائے کہ اردو کی تہذیبی جڑیں کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہر زبان کی جڑیں اُس کی تہذیب میں ہوتی ہیں۔ اردو کی جڑیں عوام کے دل میں ہیں اور یہ روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہے۔ کبیر کی شاعری کے اُن کے زمانے کے لکھے ہوئے نسخے نہیں ملتے۔ اسی طرح گرونانک اور بابا فرید کا کلام بھی بعد کے عہد میں لکھا اور جمع کیا گیا۔ پروفیسر نارنگ نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو سے جو ہندوی کلام، جھولے، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، انمل، ساون، بسنت، وغیرہ مشہور ہیں اُن کا کوئی دستاویزی ثبوت جو تیرھویں چودھویں صدی کا ہو، موجود نہیں لیکن

زبانی روایات ملتی ہیں۔ خسرو کے گیت ہندستان کے تیوہاروں میں گائے جاتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں کوئی عوامی ادب یا Folk Literature ہے بھی یا نہیں—— زبانی روایت کوئی ثبوت نہیں بلکہ عوام کا حافظہ اس کا ماخذ ہوا کرتا ہے۔ اردو والوں نے اس پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

امیر خسرو کے کلام کا دوسرا مسئلہ اردو زبان کے آغاز سے متعلق ہے اور اردو کا آغاز نیم تاریکی میں ہے۔ ہم کھڑی، برج، ہریانی، پنجابی اور پالی سے اردو کے آغاز کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ کوئی واضح نظریہ آج بھی موجود نہیں۔ ہندی والے امیر خسرو کو ہندی کا پہلا بنیاد گزار شاعر تسلیم کرتے ہیں لیکن اردو والے زبانی روایت کے لیے دستاویزی ثبوت چاہتے ہیں۔ یہ مسئلہ آج تک تشفی بخش طور پر حل نہ ہو سکا۔ یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ امیر خسرو کی ہندوی شاعری سے کوئی روشنی ملتی ہے یا نہیں۔

امیر خسرو فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اُن کی فارسی تخلیقات اور کلام کے نسخے دنیا بھر کی لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ امیر خسرو نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، اُن کی شخصیت جامع صفات تھی۔ وہ شاعروں میں شاعر، صوفیوں میں صوفی، امرا میں امیر، درباریوں میں درباری، سپاہیوں میں سپاہی، منصبداروں میں منصبدار اور عام آدمیوں میں ایک عام انسان تھے۔ سوچنا یہ ہے کہ ایسے شخص کو کیا ضرورت تھی کہ ایسی زبان کو منہ لگائے جو کچی پکی اور نوزائیدہ تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کے ریختہ کلام کے سلسلے میں چار ناموں کو اہم قرار دیا جس میں سے دو اسمائے گرامی حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سید حسن بلگرامی عماد الملک اور شمس اللہ قادری کے نام ہیں۔ تیسرا نام جرمن مستشرق اسپرنگر کا ہے جس کی وجہ سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کے کچھ نمونے برلن میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے بتایا کہ ان مستشرقین کے بعد آخری کام خود نارنگ صاحب کا ہے۔ جنھوں نے امیر خسرو کے کلام کو متعارف کروایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انکشاف کیا کہ سید حسن بلگرامی عماد الملک کی سعی جمیلہ سے 1914 میں امیر خسرو کے کلام کی اشاعت علی گڑھ سے عمل میں آئی اور شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ اسپرنگر نے اپنے خطبات میں امیر خسرو کا کلام درج کیا ہے جو 1853 میں شائع ہوئے۔ اس طرح حیدرآباد کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے دو معروف محققین کی وجہ سے امیر خسرو کا کلام محفوظ ہوا اور سامنے آیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بتایا کہ امیر خسرو کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی کہی ہوئی پہیلیاں، انمل، وغیرہ اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کا خالق کوئی جید عالم اور ہمہ لسانی ماہر ہے۔ اعجاز خسروی میں کافی صنعتیں ملتی ہیں۔ انھوں نے معموں اور پہیلیوں میں عجیب و غریب کمال دکھایا ہے۔

پروفیسر نارنگ نے اپنے خطبے میں امیر خسرو کے فارسی کلام سے متعدد مثالیں ریختے کی پیش کیں اور کہا کہ امیر خسرو نے یقیناً اردو میں طبع آزمائی کی ہے لیکن انھوں نے اپنے اس کلام کو محفوظ نہیں کیا بلکہ نذرِ دوستاں کر دیا۔

پروفیسر نارنگ نے کہا کہ صحیح معنوں میں ریختہ، ہندوی یا اردو کے اولین نقوش حضرت امیر خسرو کی تخلیقات سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ امیر خسرو کا زمانہ کبیر سے بھی ایک سو برس پہلے کا ہے۔ کبیر سے پہلے ہر طرف امیر خسرو ہی امیر خسرو تھے۔ اُن کے کلام سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے فارسی کلام میں ہندستان، ہندستانی مذاہب، علم و زبان، پرندے، موسم، پھلوں اور پھولوں کے بارے میں شدت احساس سے اظہار خیال ملتا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں وطن دوستی اور وطن سے محبت کی ایسی مثالیں کہیں اور نہ ملیں گی۔

امیر خسرو ہندستان کی تمام زبانوں کو ہندوی کہتے ہیں اور اپنی زبان کو ہندوی دہلوی قرار دیتے ہیں۔ امیر خسرو کا چوتھا دیوان اُس وقت مرتب ہوا جب اُن کی عمر پینتالیس برس تھی۔ امیر خسرو اس کے دیباچے میں کہتے ہیں "میں نے ہندی میں شعر کہے ہیں۔ میں ہندستانی ترک ہوں۔ میں پانی کی طرح ہندوی زبان میں گفتگو کرتا ہوں، میں عربی میں بات نہیں کر سکتا، میں ہندستان کا طوطی ہوں۔ مجھ سے ہندوی میں بات کرو میں پانی کی طرح ہندوی میں بات کرتا ہوں۔ ترکی اور فارسی پر میں ہندوی کو ترجیح دیتا ہوں۔"

اپنے آخری دیوان غرۃ الکمال میں انھوں نے بعض ایسے مصرعے بلکہ بعض شعر قلمبند کیے ہیں جو فارسی اور ہندوی میں یکساں پڑھے جا سکتے ہیں اور جو دونوں ہی زبانوں میں بامعنی ہیں۔ دہی لیموں ہی، ان تتوں میں تیل نہیں، ہے ہے تیر مارا جیسے صاف ہندوی ٹکڑے بھی ملتے ہیں۔ اُن کے عہد کے بعد فارسی اور دکنی کے ادبا و علما نے بھی امیر خسرو کے ہندوی کلام کی شہادت دی ہے۔ وجہی نے سب رس میں امیر خسرو کا ایک دوہا درج کیا ہے۔ چمنستان الشعراء میں بھی امیر خسرو کا ہندوی کلام موجود ہے۔ اس کے علاوہ مجموعہ نغز، نکات الشعرا اور مخزن نکات میں بھی ریختہ کے ضمن میں امیر خسرو کے ایسے شعر ملتے ہیں جن کا ایک مصرع فارسی کا ہے تو دوسرا اردو کا یا پھر آدھا مصرع فارسی کا باقی آدھا اردو کا—— ان کے دوہوں کا لسانی مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان میں کہیں برج تو، کہیں کھڑی کا اثر و رنگ ملتا ہے۔ اُن کی پہیلیوں میں سرائیکی کے اثرات بھی ملتے ہیں جیسے نقارہ والی پہلی میں "ڈھنی" کا لفظ خاص سرائیکی کی نشاندہی کرتا ہے یا چراغ والی پہلی میں چھاڑو کا لفظ—— 'ڈ' کی یہ آواز 'ڑ' کے آنے سے پہلے کی ہے۔ ان پہیلیوں میں ہریانی کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بتایا کہ جب وہ 1982 میں برلن گئے تو

وہاں انھیں اسپرنگر کے ذخیرۂ کتب میں ایک ایسی جلد ملی جس میں چھوٹے چھوٹے رسالے مجلد تھے۔ ان ہی رسالوں میں سترہ اوراق ایسے بھی تھے جن میں اسپرنگر کے مضمون میں بیان کردہ چھ کی چھ امیر خسرو کی پہیلیاں موجود تھیں۔ ان چھ پہیلیوں کے اوپر رومن میں متن لکھا گیا ہے جو خود اسپرنگر کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ان اوراق میں جملہ 144 پہیلیاں درج ہیں۔ اس کلام میں ہو سکتا ہے کہ کچھ الحاقی بھی ہو لیکن اندرونی شہادت یعنی لفظوں کا در و بست، عربی فارسی سنسکرت پراکرت اپ بھرنش اور سرائیکی کا ایسا اثر عہدِ وسطیٰ میں کسی دوسری شخصیت کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان تمام شواہد کی بنا پر ہمیں امیر خسرو کے کلام کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ امیر خسرو کی طباعی، تخلیقی اپج، فارسی سنسکرت پر ان کی دسترس، یہ ایسی داخلی شواہد اور شہادتیں ہیں جن سے یہ یقین کرنا ہوگا کہ ان کا مصنف امیر خسرو کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس کلام کا کوئی دوسرا مصنف دریافت نہ ہو جائے، امیر خسرو کو ان کے حق سے محروم کرنا مناسب نہیں۔

محمد قلی قطب شاہ میموریل خطبے کی ابتدا میں پروفیسر رحمت یوسف زئی، صدر شعبۂ اردو، حیدر آباد سنٹرل یونی ورسٹی نے محمد قلی قطب شاہ کی شان میں سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے اردو کے اس پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی ادبی عظمت کو نمایاں کیا۔ انھوں نے کہا کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا شمار صرف دکن نہیں بلکہ ہندستان کے چند نباض اور امن پسند حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا کارنامہ حیدر آباد کی تاسیس ہے۔ اُس نے ایک منصوبہ بند شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس کی شاعری میں ہندستانی زندگی کے رنگ برنگ حسن کے ساتھ ساتھ علاقائی عناصر بھی ملتے ہیں۔ اُس کی شاعری سے دکن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے اور خالص ہندستانی جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ تعصب اُس کو چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے آج کے لکچر کو اردو کے اس محسن شاعر کے نام معنون کیا۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے اسکالرز نسیم سلطانہ، تہنیت جبین، عرفانہ تبسم اور سعیدہ نے شعبے کی جانب سے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے۔ اس یادگار خطبے کے مہمان خصوصی جسٹس سردار علی خاں، سابق صدر نشین قومی اقلیتی کمیشن حکومتِ ہند نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خطبے کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ بہت عالمانہ اور بصیرت افروز لیکچر تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ امیر خسرو نے ہندستانیت کو اپنے اظہار کا ایک اہم پہلو بنا لیا تھا، اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ اس یادگار خطبے کے صدر پروفیسر اے کے بھٹناگر نے اپنے صدارتی کلمات میں شعبۂ اردو اور اُس کے اساتذہ کے تخلیقی کارناموں کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر گیان چند جین نے شعبے کی تاسیس کے بعد درس و تدریس اور تحقیق کی جو شمع جلائی تھی اُسے آج کے اساتذہ مزید فروزاں کر رہے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ حیدر آباد سنٹرل یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو ملک بھر میں مثالی شعبہ ہوگا جس کا نام فخر سے لیا جائے گا۔ محمد قلی قطب شاہ یادگار خطبے کے کنوینر پروفیسر محمد انوار الدین نے بڑے سلیقے سے جلسے کی کارروائی چلائی اور آخر میں شکریہ ادا کیا۔ — اس یادگار خطبے میں حیدر آباد کی تقریباً سبھی نامور ہستیوں نے شرکت کی جس کی وجہ سے اردو ہال اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کر رہا تھا۔ (ڈاک سے)

الٰہ آباد میں پروفیسر اعجاز حسین یادگاری خطبہ

● الٰہ آباد، 21/اپریل۔ ہندستانی اکادمی کے قیام کے سو سال پورے ہونے پر اقبال اور غالب کے موضوع پر اکادمی کے ہال میں یادگاری خطبہ پیش کیا گیا۔ پروفیسر اعجاز حسین یادگاری خطبے کے تحت دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر عبدالحق نے اس موقع پر تفصیل کے ساتھ اقبال اور غالب کے فکری رجحانات اور ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ جلسے کی صدارت شعبۂ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی کے سابق صدر پروفیسر عقیل رضوی نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ممتاز ناقد شمس الرحمان فاروقی نے شرکت کی۔ جلسے کی نظامت شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے انجام دی۔ اس موقع پر مقررین نے پروفیسر اعجاز حسین کی ادبی خدمات کا بھی ذکر کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کی نظم، غالب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کو اردو ادب میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والی سب سے اچھی نظم قرار دیا۔

ممتاز ناقد شمس الرحمن فاروقی نے پروفیسر اعجاز حسین کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اعجاز حسین مرحوم جتنی اچھی گفتگو کرتے تھے اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اعجاز حسین نہ صرف ایک اچھے ادیب تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے اعجاز حسین کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ جلسے کے اختتام پر ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ہندستانی اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

جامعہ ہمدرد میں اردو ذریعہ تعلیم پر سمپوزیم

● نئی دہلی، 18/اپریل۔ "مدارس کے طلبہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی سے عصری علوم حاصل کریں تاکہ دین اور سائنس دونوں کے ذریعے ان کے تشخص کی تشکیل ہو۔" کل یہاں اردو کے ذریعہ تعلیم پر ایک سمپوزیم سے خطاب کرتے ہوئے جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور ممتاز ماہر تعلیم سید حامد نے کہا کہ مدارس کے ذمے داروں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا

چاہیے کہ اردو یونی ورسٹی اور مدارس کس طرح مضبوط رابطہ قائم کر کے عصری تعلیم کے حصول کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔

سمپوزیم میں شریک سر کردہ دانشوروں، ماہرینِ تعلیم اور مدارس کے ممتاز علما نے اردو یونی ورسٹی کی چار سالہ کارکردگی اور پیش رفت پر اطمینان ظاہر کیا اور اردو میڈیم سے تعلیم کے لیے اسے وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ سمپوزیم کا اہتمام مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی نے کیا تھا۔ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جے راج پوری نے یونی ورسٹی کے چار سالہ سفر کی روداد سے مطلع کرتے ہوئے بتایا کہ یونی ورسٹی اب اپنے کیمپس میں منتقل ہو چکی ہے اور ڈگری کورسیز کا پہلا بیچ فارغ ہو چکا ہے۔ پروفیسر جے راجپوری نے بتایا کہ سردست یونی ورسٹی میں طلبہ کی تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔ یونی ورسٹی کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو والوں کی سرد مہری کا گلہ بھی کیا مگر اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے دہرانے نہیں دیا جائے گا۔

یونی ورسٹی کے دہلی ریجنل سینٹر کے ڈائرکٹر ایس آئی فاروقی نے عصری تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کے بغیر ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا مدارس کے ذمے داران اس طرف سنجیدگی سے غور کریں اور ٹھوس لائحۂ عمل تیار کریں۔ جامعۃ الہدایہ (جے پور) کے مولانا فضل الرحمان مجددی نے کہا کہ مدارس کے بنیادی کردار کو متاثر کیے بغیر عصری علوم کا حصول ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے مسٹر اقبال احمد، مولانا ظفر الدین احمد، مدرستہ العلوم حسین بخش کے مولانا قاسم، بھوپال کے مفتی اعظم عبدالرزاق، تاج المساجد بھوپال کے مولانا سلیم الدین قاسمی اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے مولانا مقبول احمد فلاحی نے بھی سمپوزیم سے خطاب کیا۔

سمپوزیم میں اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں پروفیسر جیراج پوری کی خدمات کی ستائش کی گئی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اقبال کی شاعری میں منظر نگاری

● بھوپال، 4 راپریل۔ "اقبال کی شاعری میں منظر مقصد نہیں ہے بلکہ وہ مقصد کو پیش کرنے میں منظر سے کام لیتے ہیں۔ ان کی منظر نگاری اسٹل کیمرے کی نہیں بلکہ موری کیمرے کی منظر نگاری ہے۔" ان خیالات کا اظہار پروفیسر حسن مسعود نے کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز کے تحت اقبال کی شاعری میں منظر نگاری کے موضوع پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کی شاعری میں خارجی اور جذباتی منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

اس جلسے کا کلیدی پرچہ اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر سرسوتی سرن کیفؔ کا تھا جنھوں نے تفصیل کے ساتھ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں منظر نگاری پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اقبال کے کلام میں قدرتی اور دوسرے مناظر کی عکاسی کا مقابلہ ورڈز ورتھ، بائرن، فانی، غالب، فرانسیسی شاعر دلیزل اور کالی داس کی میگھ دوت اور رتو سنگھار سے کیا اور کہا کہ کس طرح مناظر قدرت کی کیفیت سے شاعر کے جذبات کا تضاد ابھرتا ہے۔ سرسوتی سرن کیف نے اقبال کی منظر نگاری کو مفکرانہ منظر نگاری قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ مناظر قدرت کے اجزا کو انسانی شخصیت عطا کر کے ان کے اعمال سے اپنے فلسفیانہ نقطہ نظر کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھوں نے قدرتِ زبان اور فنِ شاعری کی مکمل مہارت کی بنا پر منظر نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں۔

ابتدا میں مرکز کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے کیف صاحب کا تعارف کرایا۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ (ندیم، بھوپال)

پٹنہ میں کل ہند فارسی اساتذہ کانفرنس

● پٹنہ، اپریل۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں آل انڈیا پرشین ٹیچرس کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں صوبہ بہار کے مختلف شہروں، علی گڑھ، دہلی، بنارس نیز افغانستان و ایران کے فارسی زبان و ادبیات کے دانشوروں نے شرکت فرمائی۔

جلسے کا آغاز مدرسے کے استاد قاری محمد اکرام حسین کی تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ مولانا ابوالکلام قاسمی نے کلماتِ خیر و سپاسنامہ پیش فرمایا۔ پھر مولانا محمد سعید احمد شمسی نے مدرسے کا تعارف کرایا۔ پروفیسر بہمن سرکارانی نائب صدر فارسی اکادمی تہران نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ دینی مدارس میں فارسی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ان مدارس کے سلسلے میں جو غفلت برتی جاتی ہے اسے ختم کیا جانا چاہیے۔ مشہد یونی ورسٹی سے آئے پروفیسر محمد مہدی ناصح نے فرمایا کہ میں خود دینی مدرسے کا فارغ ہوں اور بعد میں یونی ورسٹی سسٹم میں آیا ہوں۔ تہران یونی ورسٹی سے آئے پروفیسر جلیل تجلیل نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ زمانۂ قدیم میں ہمارے علما اور دانشوران انھیں مدارس کے فارغ التحصیل ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر عبدالخالق رشید نے جو افغانستان کی کابل یونی ورسٹی کے شعبۂ پشتو سے منسلک ہیں، افغانستان کے مدارس کا تعارف پیش فرماتے ہوئے کہا کہ عہدِ قدیم میں ہندستان اور افغانستان کے مدارس کے علماء اور طلبہ آزادانہ طور پر آتے جاتے رہتے تھے، اس سے علم کو فروغ ملتا تھا۔ پروفیسر عابدی دہلوی نے فرمایا

کہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ ایک قدیم ادارہ ہے۔ یہاں کے علما علم و دانش کی خدمت میں خاموشی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ جناب رام لکھن رام رمن وزیرِ تعلیم بہار نے اجلاس کو پیغامِ محبت دیتے ہوئے کہا کہ ہم میں محبت واخوت کی بنیاد کھوکھلی ہوتی جارہی ہے اس سے ملک کو خطرہ ہے۔ اس لیے محبت اور اخوت کا رشتہ مضبوط کرنے اور اس کے لیے تعلیم کے میدان کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان وادب کے دانشوروں نے اپنے مقالات پڑھ کر سنائے۔ یہ اجلاس دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ نشست اوّل کی نظامت پروفیسر عبدالودود اظہر نے اور نشست دوم کی نظامت خانم بلقیس فاطمہ نے انجام دی۔ مولانا خواجہ عبدالہادی استاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی نئے کیمپس میں

●حیدر آباد، 15 راپریل، ملک کی پہلی اُردو جامعہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی نے قدرتی مناظر سے بھرپور گچی باؤلی علاقے میں واقع دو سو ایکڑ اراضی پر محیط اپنے کیمپس میں کام کاج شروع کردیا ہے۔ یونی ورسٹی کی تعمیر شدہ اصل عمارت اپنی وسعت اور طرزِ تعمیر کے اعتبار سے منفرد اور پُرکشش عمارت ہے جس کے پرشکوہ کانفرنس ہال میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے بتایا کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے پروجیکٹ کے پہلے مرحلے کی تکمیل کے لیے 18.5 کروڑ روپے جاری کردیے ہیں۔

پروفیسر شمیم جیراجپوری نے یونی ورسٹی کے چار سالہ سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو یونی ورسٹی کے لیے اپنی کارکردگی کی انجام دہی زیادہ مشکل اس لیے بھی ہے کہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سمیت تمام سطحوں پر اس کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ رجسٹرار یونی ورسٹی پروفیسر صدیقی نے کہا کہ ڈگری سطح پر پہلا بیچ مکمل ہوچکا ہے۔ توقع ہے کہ 4000 طلبہ اس سال فارغ ہوں گے۔ انھوں نے بتایا کہ بی اے، بی کام اور بی ایس سی کے کورس میٹریل اُردو میں دستیاب ہیں۔ اندرا گاندھی اوپن یونی ورسٹی کے بی کام نصاب کو اختیار کرتے ہوئے تاحال 25+29 بلاکس (کتابوں) کا ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ رجسٹرار یونی ورسٹی نے بتایا کہ یونی ورسٹی میں فی الحال اُردو، انگریزی، ہندی، جرنلزم، ویمن ایجوکیشن اور ایجوکیشن شعبے کے قیام کی تیاری ہورہی ہے۔ اُردو میں ایم اے، اُردو کے ذریعے انگریزی سیکھنے کا ایک سالہ ڈپلوما کورس، ایک سالہ اسکرپٹ رائٹنگ کورس، انگریزی میں چھ ماہی فنکشنل انگلش کورس، ایک سالہ ڈپلوما کورس برائے اساتذہ، جرنلزم میں چھ ماہی رپورٹنگ اینڈ فیچر رائٹنگ، ایک سالہ ٹیلی ویژن پروڈکشن اور ایک سالہ کورس برائے پبلک ریلیشنز شروع کیے جانے کی تجویز ہے۔ ٹیکنیکل اینڈ ویمن ایجوکیشن شعبے کے تحت روزگار کے ضامن کورس جیسے چھ ماہی ڈومسٹک اپلائنسز، الکٹریکل موٹر وائنڈنگ، ٹو/تھری وہیلرس آٹو موبائل میکانزم کورس شروع کیے جائیں گے جبکہ ڈی ایڈ کا کیمپس کورس شروع کیا گیا ہے جس کے لیے تعلیمی قابلیت (10+2) اور دسویں جماعت تک اُردو میڈیم ذریعہ تعلیم ضروری ہے۔ یہ کورس ہندستان بھر میں اُردو کا منفرد دو سالہ ڈپلوما تصور کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ بی ایڈ کورس کی منظوری کے لیے یونی ورسٹی نے NCTE سے رجوع کیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیشن ڈیزائننگ کے اشتراک سے ایمبرائیڈری اور ڈریس کٹنگ میں علاحدہ سرٹیفکیٹ کورس شروع کیے جانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فاصلاتی تعلیم میں یونی ورسٹی کے طلبہ کی تعداد 15 ہزار ہے۔ یونی ورسٹی کی ایک شاندار لائبریری ہے جسے ساری دنیا کی اہم لائبریریوں سے مربوط کرنے کے پراجیکٹ کے لیے 6.5 لاکھ کی خصوصی گرانٹ ملی ہے۔ مولانا آزاد یونی ورسٹی نے اپنے پانچویں تعلیمی سال میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت مختلف کورسوں میں داخلے کا اعلان کیا ہے۔ (ڈاک سے)

دس سرکاری اسکول گود لیے گئے

●کرناٹک ریاست میں تقریباً 4 ہزار اردو مدارس ہیں جہاں 4 لاکھ سے زائد بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ ان میں سے اکثر کی حالت انتہائی خستہ ہے اور ان اسکولوں میں پانی، بیت الخلا اور فرنیچر اور چند معاملوں میں عمارت تک بھی نہیں ہے۔ اسی لیے اردو مدارس میں ڈراپ آؤٹ کی شرح بہت زیادہ ہے۔

اردو مدارس کے حالات سدھارنے کے لیے حکومت کرناٹک نے نجی رضاکار اداروں کی طرف سے ان اسکولوں کو گود لینے کی ایک اسکیم بنائی تاکہ ان اسکولوں کا انفراسٹرکچر اور تعلیمی معیار بہتر بنایا جاسکے۔ خراب صورت حال کو کچھ حد تک دور کرنے کے لیے سماجی کارکنوں اور مطیع حضرات کا ایک گروپ سامنے آیا اور اس نے ایک ٹاسک فورس شریف فاؤنڈیشن کے تحت قائم کی تاکہ اسکولوں کو گود لینے کی اسکیم کے تحت کرناٹک کے اردو اسکولوں کو ترقی دی جائے اور انھیں بہتر بناکر ان کی نگرانی کی جائے۔ جناب ضیاء اللہ شریف مالک انڈیا بلڈرس کارپوریشن کی صدارت میں قائم اس ٹاسک فورس میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں بانی الامین تحریک، رکن راجیہ سبھا جناب کے۔ رحمٰن خاں، جناب عرفان رزاق، منیجنگ ڈائرکٹر پرسٹیج گروپ آف کمپنیز، جناب اے آر قمرالدین، جناب نور احمد کلی اور جناب محمد کلیم اللہ شامل ہیں۔ اس

اسکیم کے تحت اسکولوں میں نرسری تعلیم، تمام بچوں کو اسکولوں تک رسائی، اسکول کی مرمت، انفرااسٹرکچر کی فراہمی، اضافی کمروں اور کھیل کود کے سامان کی فراہمی، بچوں کو دوپہر کے کھانے اور پانی کی فراہمی، بچوں کو یونیفارمس کی فراہمی، اساتذہ کو بہتر سے بہتر تعلیم دینے کے لیے ترغیب، لیباریٹریز اور لائبریری کی فراہمی، غیر از نصابی سرگرمیوں کو فروغ، پہلی جماعت سے ہی انگریزی اور کثیر از بان میں تعلیم، اسکولوں میں کمپیوٹرس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا رواج، اسکولوں میں تعلیمی ماحول بنانا، سماجی کارکنوں اور ماہرین سے اسکول بہتر بنانے کے لیے مشاورتی خدمات لینا وغیرہ شامل ہیں۔

اس پروجیکٹ کے تحت شریف فاؤنڈیشن نے حکومتِ کرناٹک اور ڈپارٹمنٹ آف پبلک انسٹرکشنز کے ساتھ ایک میمورنڈم آف انڈر اسٹینڈنگ کے تحت دس اسکولوں کو اپنے ماتحت لیا ہے۔ ان میں سب سے اوّل دیورجیونہلی علاقے کا گورنمنٹ اردو ماڈل پرائمری و ہائی اسکول ہے۔

اس کے علاوہ شریف فاؤنڈیشن نے جن اسکولوں کو گود لیا ہے وہ سرکاری اردو اسکولس ان علاقوں میں ہیں۔ رحمت نگر، چامنڈی نگر، منڈیلی، جوگوپالیہ، نیہندرا، اشوک نگر اور راجیندر نگر۔ علاوہ ازیں شریف فاؤنڈیشن نے سری رنگا پٹم میں بھی ایک سرکاری اقامتی اسکول کو گود لیا ہے اور اپنے ٹیپو سلطان اڈوانسڈ اسٹڈی اینڈ ریسرچ سنٹر کے احاطے میں ایک ایکڑ زمین اس اقامتی اسکول کو بطور عطیہ دی ہے۔ فاؤنڈیشن کے روح رواں اور چیئرمین جناب ضیاء اللہ شریف کا کہنا ہے کہ فاؤنڈیشن ان خدمات کے علاوہ موبائیل سائنسی لیبارٹری فراہم کرے گی جس میں سائنسی آلات کے ساتھ ملٹی میڈیا سہولتیں بھی ہوں گی جو مقررہ مدت میں اسکولوں کا دورہ کرے گی۔ ساتھ ہی فاؤنڈیشن دیگر اصحاب حیثیت کو اسکولس گود لینے کی ترغیب بھی دلائے گی اور ان کی رہنمائی اور تعاون بھی کرے گی۔ (سالار، بنگلور)

اردو جاننے والوں کے لیے ''اردو صحافت کورس''

● نئی دہلی، یکم مئی۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن نئی دہلی نے ''اردو صحافت کورس'' شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اطلاع یہاں جاری ایک ریلیز میں دی گئی ہے۔ صحافت اور ذرائع ابلاغ کی دنیا میں 1965 سے ہندی اور انگریزی میں جرنلزم کورس اور الیکٹرانک میڈیا ٹریننگ کے کورسیز چلانے والے اس ادارے کے ڈائرکٹر سدھیر شرما (آئی اے ایس) نے بتایا کہ وہ ایک عرصے سے اردو میں بھی صحافت کورس شروع کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ریلیز کے مطابق اردو جاننے والے ان طالب علموں کو جو اخبار نویسی اور الیکٹرانک میڈیا میں کیریر شروع کرنا چاہتے ہیں، اس کورس سے زبردست تحریک ملے گی۔ اعلان شدہ کورس دس ماہی ہوگا جو یکم اگست 2002 سے شروع ہوگا۔ کورس کے دوران اخبار نویسی کے فن کے ساتھ ترجمہ، اداریہ و مضامین نویسی، ایڈیٹنگ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا (ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ) کی بھی تربیت دی جائے گی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

سفینہ پبلک لائبریری میں ''حسینی کلکشن''

● نئی دہلی، 24 اپریل۔ ہندستان کے معروف ادیب علی عباس حسینی اور ماہنامہ آج کل کے سابق ایڈیٹر مہدی عباس حسینی کا ذاتی کتب خانہ ان کے رشتے داروں نے آج سفینہ پبلک لائبریری کو منتقل کردیا۔ یہ کام مسٹر نند کشور وکرم کی سعی و کوشش سے انجام پایا۔ اس موقع پر حجتہ الاسلام والمسلمین علامہ سید ذوالقدر رضوی چیئرمین انٹرنیشنل اسلامک تھنک (لندن) نے اس طرح کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ان کتابوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا کہ جس قوم کے پاس کتاب نہیں ہے وہ قوم یتیم ہے۔

سفینہ پبلک لائبریری کے سرپرست حجتہ الاسلام مولانا سید ذیشان ہدایتی نے ''حسینی خاندان'' کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہماری لائبریری میں کتابوں کا جو اضافہ ہوا ہے وہ باعث خوشی و مسرت ہے لیکن حقیقی خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب ان کتابوں سے لوگ استفادہ کریں گے اور اسے اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کا وسیلہ بنائیں گے۔ (قومی آواز، دہلی)

بہار اردو اکادمی کے کمپیوٹر سینٹر کا جلسہ تقسیم اسناد

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام بہار اردو اکادمی میں چل رہے کمپیوٹر تربیتی مرکز کا دوسرا جلسہ تقسیم اسناد پٹنہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے کی۔ جلسے کا افتتاح ٹیلیکم بہار سرکل کے سابق چیف جنرل منیجر جناب رستم علی نے کیا جب کہ مہمانِ خصوصی قانون ساز کونسل کے رکن ڈاکٹر محمد شمیم تھے۔

جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے بہار اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر رضوان احمد نے بتایا کہ اس مرکز سے کمپیوٹر تربیت حاصل کرکے دو بیچ نکل چکے ہیں اور ان میں بہتوں نے زندگی کی راہوں میں اس ٹریننگ سے کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جلد ہی بہار اردو اکادمی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے ایک گرافک اینڈ ڈیزائننگ سینٹر بھی کھولا جارہا ہے جس میں ایک بیچ میں 60 طلبہ ٹریننگ حاصل کرسکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ

کوروزگار مرکوز ٹریننگ دی جائے۔ بہار اردو اکادمی اس سمت میں سرگرمی سے کام کررہی ہے۔ انھوں نے کہاکہ اکادمی تمام اداروں کا تعاون حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔

جناب رستم علی نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے کہاکہ آج انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے زندگی کے راستوں کو بہت تبدیل کردیا ہے۔ انھوں نے بہار اردو اکادمی کی ستائش کرتے ہوئے کہاکہ اس کی ارباب حل و عقد نے عصری ضرورتوں کو محسوس کیا اور اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد شمیم ایم ایل سی نے کہاکہ ہمارے طلبہ کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیے کہ وہ کم سے کم وقت میں تربیت حاصل کرکے روزگار پاسکیں۔

اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے کہاکہ انھیں اس جلسے میں آکر اور طلبہ میں اسناد تقسیم کرکے بے حد خوشی ہورہی ہے کیوں کہ اس سند کے سہارے طلبہ اپنے عزائم میں کامیاب ہوسکیں گے۔ انھوں نے اس موقعے پر طلبہ و طالبات کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

حاضرین کا شکریہ رخصت ہونے والے بیچ کی طالبہ شازیہ احمد نے ادا کیا۔ انھوں نے اپنے تمام اساتذہ اور ادارے کے ارکان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہاکہ ان لوگوں نے بڑی محنت و تندہی سے طلبہ کی تربیت کی جس کے لیے ہم سب ان کے شکر گزار ہیں۔ اس موقعے پر 58 طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ امتیازی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو شیلڈ اور کپ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے طلبہ و طالبات کو میڈل دیے گئے۔ (ڈاک سے)

ایلمیوز کمپیوٹر سینٹر ممبئی میں تقسیم اسناد کا جلسہ

● ممبئی۔ 27ر اپریل 2002 کو ایکمیو جے۔ آر کیریئر سینٹر ممبئی کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کے ایک سالہ کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی ڈپلوما کے کامیاب طلبہ و طالبات کے لیے جلسہ تقسیم اسناد کی تقریب کا اہتمام تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا جس میں صدر مجلس، جناب ڈاکٹر یامین فاروقی اور مہمان خصوصی پروفیسر کلانیہ تھے۔ ظہیر احمد خان، ڈاکٹر امتیاز صدیقی، سید حسن اکبر، ادریس خان، الیاس خان، ڈاکٹر رحمت اللہ نے بھی محفل میں شرکت کی۔

جلسے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ بعد ازاں جلسے کے کنوینر محمد خالد کی درخواست پر انتظامیہ کے رکن جناب عطاء الرحیم صاحب نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ جلسے کی صدارت جناب ڈاکٹر یامین فاروقی، رکن قومی اردو کونسل نے کی۔ سینٹر سوپروائزر جناب سید زاہد احمد نے ایک سال کی کارکردگی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایاکہ گزشتہ سال کل 69 طلبہ و طالبات نے داخلہ لیا تھا لیکن 54 طلبہ ہی امتحان میں حاضر ہوئے۔ ان میں 53 نے امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی جب کہ صرف ایک طالب علم 74 فی صد نمبر سے کامیاب رہا۔ انھوں نے مرکز کے قیام میں ایڈووکیٹ یوسف ابراہنی، دارالعلوم محمدیہ اور جناب عارف مرچنٹ کے ہمہ وقتی تعاون کو سراہتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بتایاکہ طلبہ کی بہتر فنی تربیت کے لیے انتظامیہ کی جانب سے 6 عدد اضافی کمپیوٹروں کا نظم کیا گیا ہے۔ اس اضافی سہولت کی بنا پر گزشتہ سال سینٹر کی طرف سے جے آر اسکول کے 300 طلبہ کو بنیادی کمپیوٹر کی مفت تعلیم دی گئی۔ اس وقت بھی 50 طلبہ کو کمپیوٹر کورس کی مفت تعلیم دی جارہی ہے۔

جلسے کے مہمان خصوصی پروفیسر کلانیہ نے حاضرین سے خطاب فرماتے ہوئے طلبہ کو مشورہ دیاکہ آپ سماج میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور پوری چستی اور لگن سے فنی تعلیم و تربیت حاصل کریں تاکہ آپ اپنے میدان میں امتیازی مقام حاصل کرسکیں۔

دیگر مہمانوں میں جناب ادریس خان، الیاس خان، امتیاز احمد صدیقی و ڈاکٹر ظہیر احمد خاں BARC کے سائنٹسٹ اور جناب طاہر شریف نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔

آخر میں ڈاکٹر یامین فاروقی نے ایکمیو کے چیئرمین ڈاکٹر رحمت اللہ اور ان کے رفقائے کار کو اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد پیش کی اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کی۔ علاوہ ازیں یہ وعدہ کیاکہ ایڈوانس کورس کی سہولت فراہم کریں گے۔ انھوں نے یہ اعلان فرمایاکہ NMDFC کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے وہ ادارے کی طرف سے ٹیلرنگ اور ایمبرائڈری کے علاوہ نرسنگ اور پیتھالوجی ٹریننگ سینٹر کے لیے مالی سہولت فراہم کریں گے۔

جلسے کے اختتام پر چیئرمین ایکمیو اور سینٹر انچارج ڈاکٹر رحمت اللہ نے تمام مہمانان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور اس توقع کا اظہار کیاکہ سینٹر کو حسب سابق تمام حضرات کا تعاون حاصل رہے گا۔ اس موقعے پر انھوں نے جے آر اسکول کے ہیڈ ماسٹر، امامباڑہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس اور میونسپل کارپوریشن آف گریٹر ممبئی کے شعبۂ تعلیم کا خصوصی شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے سینٹر کی جگہ کا حصول ممکن ہوا۔

بزرگ ممبر جناب طاہر شریف صاحب کی دعا پر مجلس کے اختتام کا اعلان ہوا۔ (ڈاک سے)

حکیم عبدالحمید ٹرافی وجلسہ تقسیم انعامات

●دہلی۔ اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیمی رجحان اور تعلیمی معیار کو بہتر و بلند کرنے کے خیال سے نیز حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کی فعال و متحرک شخصیت اور قومی خدمات کے پیش نظر گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول اردو میڈیم اجمیری گیٹ، دہلی نے اپنے اسکول کی بہترین کلاس کو حکیم عبدالحمید ٹرافی اور اسکول کے بہترین طلبہ (اوّل، دوم، سوم حیثیت یافتہ) کو انعامات سے نوازنے کے خیال سے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن دہلی کے تعاون سے 27/اپریل کو ایک اہم جلسے کا انعقاد کیا۔ اشوک جین (ڈپٹی چیئرمین اسٹینڈنگ کمیٹی ایم سی ڈی) نے جلسہ کا افتتاح فرمایا۔ ڈاکٹر محمد نفیس حسن نے اسکول میں تعلیمی معیار کو بلند تر کرنے، والدین میں تعلیمی رجحان فروغ دینے اور طلبہ میں تعلیمی اہمیت و حوصلہ افزائی کے لیے نو بنوع پروگراموں اور اسکول میں منعقد متعدد جلسوں کی تفصیلات کرتے ہوئے حکیم عبدالحمید صاحب کی حیات و خدمات پر، جامع روشنی ڈالی۔ جناب عبدالحمید ثانی صاحب (متولی ہمدرد دواخانہ دہلی) نے ٹرافی اور انعامات تقسیم کیے۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن دہلی کی جانب سے ثانی صاحب نے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں اسکول کی کاوشوں کی ستائش کی اور آئندہ بھی اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اسکول انچارج افتخار علی ہاشمی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اسکول میں بہتر تعلیمی ماحول کے لیے ان حضرات کے تعاون کی ستائش کی۔

"تعلیم اور روزگار کے مواقع" پر ورکشاپ

●حیدرآباد، 27/اپریل۔ طلبہ علموں کو وقت کی اہمیت کو جانتے ہوئے علم حاصل کرنا چاہیے۔ جو طلب علم مقررہ مدت میں تعلیم حاصل نہیں کرسکتے انھیں سرکاری ملازمتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سلمان عابد نے ایس ایس سی کے بعد تعلیم اور روزگار کے مواقع کے زیر عنوان منعقدہ ورکشاپ میں کیا جو "کووا" کی جانب سے اردو گھر مغل پورہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سلمان عابد نے کہا کہ بعض نوجوانوں کو ریاضی اور سائنس سے الرجی ہوتی ہے۔ انھوں نے ایسے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ سائنسی مضامین میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی۔ ایس ایس سی کے بعد حصول تعلیم کے لیے سخت محنت کرنے کی صورت میں ہی کوئی طالب علم اپنا مستقبل بہتر بنا سکتا ہے۔ انھوں نے طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنی صحت پر بھی توجہ دیں۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت نے خواتین اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ اسکیمات تیار کی ہیں۔ اگر طلبہ وطالبات اپنی عمر کی قدر و قیمت کو جانتے ہوئے تعلیم پر توجہ دیں گے تو وہ تعلیم کو مکمل کرسکتے ہیں اور اچھی ملازمت یا تجارت سے وابستہ ہوسکتے ہیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر ایس این ارشد نے کووا کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

(مصنف، حیدرآباد)

بنگلور نارتھ کے اردو اساتذہ کا اجلاس

●بنگلور، 17/اپریل۔ آج یہاں کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی بنگلور نارتھ شاخ کے اساتذہ کا ایک اہم اجلاسِ عام ہوا جس میں اساتذہ اور اردو اسکولوں کو درپیش مختلف مسائل پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بنگلور نارتھ II کی بلاک ایجوکیشن آفیسر محترمہ فہمیدہ بیگم نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ چھٹیوں کے دوران 6تا14 سال کی عمر کے بچوں کو چنار انگلا پروگرام کے تحت تعلیم فراہم کریں اور انھیں اسکول واپس لائیں۔ ساتھ ہی سمودایا دتا اور دیگر پروگراموں کا صحیح استعمال کریں۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے جناب محمد نورالدین، نائب مدیر سالار نے اخبارات میں اساتذہ پر تنقیدوں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنقید اصلاح کے لیے کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حالیہ دنوں میں اردو کے اساتذہ اور اسکولوں میں ترقی کا ایک نیا رجحان دیکھا گیا ہے جو کہ ایک خوش آئند امر ہے۔ اس سے بچوں کے روشن مستقبل کی امید بھی جاگی ہے۔ اس موقع پر بنگلور نارتھ III کے بی ای او ایچ ڈی گووندے گوڈا نے بھی خطاب کیا۔ جناب اسماعیل بیگ نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ (سالار، بنگلور)

انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کی قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کو عرضداشت

●رانچی۔ ممتاز ماہر قانون جسٹس محمد شمیم، چیئرمین قومی اقلیتی کمیشن اور دیگر ارکان 5/اپریل کو ایک سرکاری دورے پر رانچی تشریف لائے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کے وفد نے کمیشن کے چیئرمین سے جھارکھنڈ کی اردو آبادی کو فوری طور پر درپیش مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی اور ایک باضابطہ عرضداشت پیش کرکے ان سے درخواست کی کہ وہ وزیر اعلیٰ جھارکھنڈ کو ان مسائل کی طرف خصوصی طور پر متوجہ کریں۔ انجمن کے صدر پروفیسر ابوذر عثمانی نے واضح کیا کہ ریاست جھارکھنڈ میں اردو کے سرکاری استعمال سے متعلق غیر منقسم ریاست بہار بشمول جھارکھنڈ کے لیے منظور شدہ قانون پر مکمل عمل درآمد ریاست کی اردو آبادی کی پہلی ضرورت ہے جسے آئینی اور قانونی بنیاد پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

کمیشن کو جھارکھنڈ اردو اکادمی کے بلا تاخیر قیام اور سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے نصاب میں فوری ترمیم واصلاح کی ضرورت سے بھی روشناس کیا گیا۔ جھارکھنڈ میں پرائمری نظام میں اردو اساتذہ کے تقرر کے مسائل کی جانب بھی کمیشن کی توجہ دلائی گئی۔

کمیشن کو مدارس کے ضمن میں یہ بتایا گیا کہ ریاست میں یہ تعلیم گاہیں اردو ذریعہ تعلیم کے اہم مراکز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بہار کی طرح جھارکھنڈ میں بھی مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ کی آزادانہ تشکیل کی جائے۔

کمیشن کے صدر کو انجمن کی طرف سے اردو سے متعلق ریاستی سطح پر کیے گئے اب تک کہ اقدامات سے باخبر کرنے کے لیے انھیں وزیر اعلیٰ کو دیے گئے تفصیلی میمورنڈم کی نقل کے ساتھ بعض اہم دستاویزات بھی فراہم کی گئیں۔ بعد میں جسٹس شمیم نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کر کے پہلے مرحلے میں اردو اکادمی کے قیام اور سی بی ایس ای کے نصاب میں مجوزہ ترمیم کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس باب میں جلد اقدام کرنے کی تلقین کی۔ وزیر اعلیٰ نے کمیشن کے چیئرمین کو یقین دلایا کہ وہ اردو اکادمی جلد ہی قائم کردیں گے اور دوسرے متعلقہ امور کے ضمن میں بھی ضروری کارروائی کریں گے۔ (ڈاک سے)

اقلیتی فرقہ اور اردو اخبارات کے مسائل پر غور وخوض

● نئی دہلی 5 / اپریل کو ایکشن کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر حافظ ماجد حسین نے اردو اخبارات کے اہم مسائل کے سلسلے میں کئی سرکردہ رہنماؤں سے ملاقات کی ساتھ ہی اقلیتی فرقے کے متعدد اہم امور پر بھی تبادلہ خیال کیا۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے قومی صدر جناب م۔ افضل سے ڈاکٹر حافظ ماجد حسین نے اردو اخبارات کے کئی مسائل کو حل کرانے کے لیے گفتگو کی۔ خاص طور پر مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں سے جاری ہونے والے اشتہارات میں اردو اخباروں کے ساتھ مسلسل ناانصافی اور امتیاز برتے جانے پر روک لگانے کی پالیسی پر غور کر کے کوئی عملی اور موثر قدم اٹھانے کی تجویز پر انھوں نے غور وخوض کیا۔

ڈاکٹر حافظ ماجد حسین نے ممبر پارلیمنٹ سریش پچوری سے ملاقات کر ان سے مدھیہ پردیش کے اردو اخبارات کے ساتھ مسلسل ہو رہی ناانصافی کو بند کرانے اور وزیر اعلیٰ کے حکم کے مطابق اردو اخباروں کو زیادہ اشتہارات دلانے کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ شری پچوری نے اس معاملے میں جلد کارروائی کی یقین دہانی کرائی۔ ڈاکٹر ماجد نے راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن ڈاکٹر نجمہ ہیبت اللہ سے بھی ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور اہم معاملوں پر تبادلہ خیال کیا اور ساتھ ہی ان کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے سکریٹری کے طور پر ڈاکٹر ماجد نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ سے تفصیلی گفتگو کر کے اردو اخباروں کو کونسل کی جانب سے بھرپور مدد نہ ملنے کا معاملہ اٹھایا اور ان سے کہا کہ اعلان کے مطابق اردو اخباروں کو ہر ماہ اشتہار جاری کیا جائے۔ اس کے علاوہ اردو اخباروں کو نیوز ایجنسی یو این آئی (UNI) اردو سروس کے لیے کمپیوٹر اور لیزر پرنٹر مہیا کرانے پر بھی گفتگو ہوئی اور کچھ ضروری جانکاری یو این آئی سے حاصل کر کے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے پر اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر بھٹ نے بتایا کہ اردو اخباروں کو یو این آئی اردو سروس میں سبسڈی اور اشتہارات فراہمی پر کل پچاس لاکھ روپے سالانہ خرچ کیے جانے کی منظوری مل چکی ہے اور ابھی تک یو این آئی اردو سروس پر سبسڈی دی جارہی تھی۔ ساتھ ہی غیر مقررہ طور سے کبھی کبھی اشتہار جاری کیے جاتے تھے لیکن اب متواتر اشتہار اگلے ماہ سے جاری ہوں گے۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

شمس الرحمان فاروقی کے اعزاز میں جلسہ

● الہ آباد، 13 / مئی۔ ممتاز ناقد شمس الرحمن فاروقی کی ادبی خدمات اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جانب سے ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کیے جانے پر شہر کے ادب نواز حلقے کی جانب سے ایک جلسہ تہنیت کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ہندی کے معروف کہانی کار مارکنڈے نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس امتیاز مرتضیٰ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ممتاز شاعر ایم اے قدیر نے اپنے تعارفی خطاب میں شمس الرحمن فاروقی کے ادبی سفر کا جائزہ لیا۔ انھوں نے فاروقی کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے چار جلدوں پر مشتمل میر تقی میر کی شرح، شعر شور انگیز کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا۔ اس موقعے پر ایم اے قدیر نے فاروقی کو ادبی خدمات پر ملے اب تک کے اعزازات کا ذکر کیا جس میں ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز سرسوتی ایوارڈ بھی شامل ہے۔

اپنے صدارتی خطبے میں کہانی کار مارکنڈے نے شمس الرحمن فاروقی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو ہندی اور اردو ادیبوں کے درمیان یکساں طور پر مقبول مصنف قرار دیا۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے بولتے ہوئے الہ آباد ہائی کورٹ کے

جج مسٹر جسٹس امتیاز مرتضیٰ نے شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں مبارکباد دی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو ادب میں جدیدیت کی بات ادب کے روایتی اور کلاسیکی سلسلے کو مربوط کرتے ہوئے کہی ہے۔

اپنے کلیدی خطبے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ہندستان میں جو لوگ اردو زبان سے مایوس ہیں، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں اردو کا نیا زمانہ پیدا ہو رہا ہے کیوں کہ ان کو نئی نسل سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اپنی کامیابی کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر انسان کو اپنے وجود کا احساس رہے تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنا وجود قائم کرنے کی کوشش کرے۔ خطبۂ استقبالیہ شاہ آفتاب احمد نے پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

مجتبیٰ حسین کی تحریروں کی دو جلدوں میں اشاعت

● نئی دہلی، 9/مئی۔ شکاگو کی ممتاز ادبی و سماجی شخصیت حسن چشتی نے "مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں" کے زیر عنوان اردو کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی چالیس سالہ مزاح نگاری کا ایک باغ و بہار انتخاب دو ضخیم جلدوں میں مرتب کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا تھا وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس انتخاب کی پہلی جلد جو مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین، سفرناموں اور کالموں پر مشتمل ہے، کچھ عرصے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کی دوسری جلد بھی شائع ہو گئی ہے جس میں مجتبیٰ حسین کے لکھے ہوئے اکتالیس شخصی خاکے شامل ہیں۔ ان میں مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، آل احمد سرور، خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، کنہیا لال کپور کے علاوہ اندر کمار گجرال، ایم ایف حسین، خوشونت سنگھ، شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ وغیرہ کے خاکے قابلِ ذکر ہیں۔ حسن چشتی نے مجتبیٰ حسین کے لکھے ہوئے دو سو سے زائد شخصی خاکوں کو سامنے رکھ کر یہ انتخاب شائع کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے 1962 میں روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے فکاہیہ کالم نگار کی حیثیت سے اپنی مزاح نگاری کے آغاز کیا تھا اور آج ان کا شمار برِصغیر کے ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ سترہ برس تک وہ اخبار کا روزانہ کالم لکھتے رہے۔ پچھلے چالیس برسوں میں مجتبیٰ حسین نے ان گنت مزاحیہ مضامین، سفرنامے رپورتاژ، شخصی خاکے اور کالم لکھے ہیں۔ انھوں نے ہندستان میں اردو طنز و مزاح نگاری کے فروغ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کے اعتراف میں ہندستان اور بیرونی ممالک میں انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ "مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں" کی دونوں جلدوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے اور ہر جلد کی قیمت 250 روپے ہے۔ ان دنوں ای ٹی وی اردو چینل سے ہر بدھ کی شام ساڑھے سات بجے مجتبیٰ حسین کے مضامین پر مبنی مزاحیہ سیریل "عجب مرزا غضب مرزا" بھی نشر کیا جا رہا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام بزم افسانہ

● بنگلور، 27/اپریل۔ "ادب آسمان سے نازل نہیں ہوتا، زمین سے پھوٹتا ہے۔ گو مضامین غیب سے آتے ہیں لیکن ادب اپنے ماحول سے نمو پاتا ہے۔" ان الفاظ کا اظہار اُردو کے معروف افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے 27/اپریل کو کنڑ بھون (نینا ہال) بنگلور میں کرناٹک اُردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ بزمِ افسانہ میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ "اُردو افسانے کی موجودہ صورتِ حال" کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُردو کی یادگار کہانیاں ترقی پسند دور میں لکھی گئیں مگر ترقی پسند افسانہ بعد میں جذباتی رومانیت، کھوکھلی نعرے بازی یا اکہری حقیقت نگاری کا شکار ہو گیا۔ جدیدیت کا خمیر تجریدیت اور وجودیت سے اُبھرا۔ اس نے روایت کا احترام نہیں کیا بلکہ اچھی روایتوں سے انحراف کیا۔ زبان، اسلوب اور تکنیک کو معنی اور موضوع پر ترجیح دی، پلاٹ کو بالکل مسترد کر دیا۔ اس طرح جدید افسانہ بھی سارے تجربات کو آزمانے کے بعد یکسانیت کا شکار ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ مابعد جدید افسانہ کسی فارمولے کا شکار ہوئے بغیر کھلی فضا میں مختلف جہتیں اور امکانات تلاش کر رہا ہے جس سے افسانے کا کھویا ہوا وقار یقیناً بحال ہو گا۔

'بزمِ افسانہ' کا آغاز جناب محمد متین الدین ندوی کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ شری سی سوم شیکھر جی، ڈائرکٹر کنڑ اکلچر ڈپارٹمنٹ نے شمع جلا کر دو روزہ بزمِ افسانہ کا افتتاح کیا۔ جنار گھوتم راؤ دیسائی (کنوینر) نے مہمانوں، افسانہ نگاروں، مبصروں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ پہلی نشست میں دو افسانے پڑھے گئے۔ جناب ش نذیر الدین (ہبلی) نے اپنا افسانہ "آدھا آدمی" پیش کیا اور پروفیسر آغا مرزا محمود سروش (میسور) نے اس پر تبصرہ کیا۔ اس اجلاس کی دوسری کہانی فرحت کمال نے پڑھی جس کا عنوان تھا "خون کی خوشبو" جس کا تجزیہ ڈاکٹر اکرام باگ نے نہایت دروں بینی سے کرتے ہوئے اسے حاضر راوی کا افسانہ قرار دیا۔ اجلاسِ اوّل کی صدارت اکادمی کے صدر جناب وہاب عندلیب نے کی۔

طعام کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس پروفیسر مسعود سراج ادیبی کی صدارت میں شروع ہوا جس میں پہلا افسانہ ضیا کرناٹکی نے پیش کیا۔ عنوان

تھا "آنکھوں والی چادر"۔ پروفیسر حمید سہروردی نے اس پر تبصرہ کیا۔ دوسرا افسانہ جناب امجد جاوید (گلبرگہ) نے پیش کیا۔ عنوان تھا "سوائے اس ایک کے" جناب عزیز اللہ بیگ نے تجزیہ پیش کیا۔ اس اجلاس کا آخری افسانہ "پڑوسی" جناب محمد یوسف عارفی نے پیش کیا۔ جناب قدیر زماں نے اس کہانی پر تبصرہ کیا۔

جناب بیگ احساس نے اجلاسِ اول و دوم میں پڑھی گئی کہانیوں کا مجموعی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرناٹک میں اردو افسانے کا مستقبل تابناک ہے۔ پروفیسر م۔ سعید نے کرناٹک کے افسانہ نگاروں سے یہ اُمید وابستہ کی کہ وہ ایسے افسانے لکھیں جن سے ان کی شناخت ہو۔ پروفیسر مسعود سراج نے صدارتی خطاب پیش کیا۔ جناب ملنسار اطہر احمد رکن اکادمی نے پہلی اور دوسری نشست کی نظامت خوش اسلوبی سے انجام دی۔

دوسرے دن خواتین افسانہ نگاروں کی نشست منعقد ہوئی۔ کلیدی خطبے میں جیلانی بانو نے کہا کہ صدیوں تک ادب میں عورت کے دو ہی روپ تھے۔ محبوبہ یا ماں، یہ دونوں مرد کی ضرورتیں تھیں۔ شراب، عورت اور رات، یہ دنیا کے سارے ادب کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انھوں نے "اردو افسانے میں عورت کا بدلتا ہوا کردار" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اردو افسانے کے مختلف ادوار سے مثالیں پیش کیں۔ آخر میں عصری حالات کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج بھی عورت روپ کنور بنا کر ستی کی چتا میں جلائی جاتی ہے، پارلیمنٹ میں 33فی صد نشستیں نہ دینے پر ہر پارٹی کے مرد اتفاق کر لیتے ہیں، وہ جہیز کے بغیر قبول نہیں کی جاتی۔ آج کی عورت اس افسانہ نگار کا انتظار کر رہی ہے جو مذہب، سیاست اور سائنس کی پھیلائی ہوئی دہشت گردی میں ایک عورت کے عزم اور جرأت کی کہانی لکھے۔

دوسرے روز کی بزمِ افسانہ بالکلیہ خواتین کے لیے مختص تھی۔ خواتین کی جانب سے پیش کیے گئے افسانوں پر خواتین ہی نے تبصرہ کیا۔ پہلا افسانہ محترمہ سمیرا حیدر نے پیش کیا۔ عنوان تھا "سورج کی زنبیل"۔ محترمہ فوزیہ چودھری نے افسانے کے فنی لوازمات پر روشنی ڈالی۔ دوسری کہانی "رحل" کوثر پروین نے پڑھی۔ تجزیہ نگار ڈاکٹر زبیدہ بیگم تھیں۔ تیسرا افسانہ محترمہ فریدہ رحمت النسا نے پیش کیا۔ عنوان تھا "ابراہیم بن گجرات"۔ یہ گجرات کے اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک فرض شناس و محبِ وطن سپاہی کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر شمیم ثریا نے افسانے کے عنوان کو معنی خیز قرار دیا اور کہا کہ یہ افسانہ وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ مبصرین کے تبصروں کے بعد افسانہ نگاروں نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ آخر میں صدر اجلاس محترمہ جیلانی بانو نے تینوں افسانوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

طعام کے وقفے کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں محترمہ ضیا روحی رکن اکادمی کے اولیں افسانوی مجموعے "پرچھائیوں کی نگری" کی رسمِ رونمائی کا فریضہ محترمہ جیلانی بانو نے ادا کیا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے محترمہ ضیا روحی کے فن و شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ بعد ازاں ضیا روحی نے اپنا افسانہ "اصحابِ کہف کی بیداری" پڑھا۔ ڈاکٹر اقبال النساء نے کہا کہ انتظار حسین کے داستانی اسلوب میں لکھا گیا یہ افسانہ متاثر کن ہے۔ آخری افسانہ نگار منیرہ اقبال تھیں جن کی کہانی کا عنوان تھا۔ "سمجھوتہ"— محترمہ شائستہ یوسف نے اس افسانے کا تجزیہ کیا۔

نشست کے اختتام پر جناب قدیر زماں، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر م۔ ن۔ سعید اور محترمہ جیلانی بانو نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے دو روزہ بزم افسانہ کو کرناٹک اردو اکادمی کی کامیاب سعی قرار دیا۔

آخری دن کے اجلاس کی کارروائی ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے چلائی۔

(ڈاک سے)

چندی گڑھ میں جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام

●چندی گڑھ۔ گذشتہ دنوں چندی گڑھ میں نیشنل ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ ٹرسٹ چندی گڑھ کے زیرِ اہتمام اہلِ چندی گڑھ نے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام کے زیرِ عنوان ایک پُر تکلف استقبالیے کا اہتمام کیا جس میں کوئی پانچ سو حضرات شریک ہوئے۔ استقبالیے کی صدارت پنجاب اور چندی گڑھ کے سابق گورنر لیفٹیننٹ جنرل بی کے این چھبر نے کی۔ جنھوں نے اپنی استقبالیہ تقریر میں جگن ناتھ آزاد کی شاعری، نثر نگاری (خاص طور پر اقبال پر اُن کے کام) تنقید اور تحقیق پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔

پروگرام کی ابتدا میں اربندر کور نے جگن ناتھ آزاد کی غزل 'جینا ہے غم سہنا ہے، غم سہہ کر مر جانا ہے' ترنم سے پیش کی۔ اس کے بعد پرمیندر کور اور کئی گلوکاروں نے آزاد کی غزلیں پیش کیں۔

موسیقی کا دور ختم ہوا تو صاحبِ صدر کی فرمائش پر آزاد نے اپنی غزلیں، نظمیں، رباعیات و قطعات اور متفرق اشعار سنائے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ہندپاک دوستی اور سیکولرزم سے متعلق تھا جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔

مذکورہ ٹرسٹ کے صدر سردار بی این ایس والیا نے جگن ناتھ آزاد کی زندگی پر روشنی ڈالی اور مشہور شاعر اور فکشن نگار کشمیری لال ذاکر نے اپنی مدلل اور عالمانہ تقریر میں جگن ناتھ آزاد کی حیات اور علمی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا اور بتایا کہ جگن ناتھ آزاد صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ آخر میں ٹرسٹ کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر جناب جس دیپ کالڑا کے شکریے پر یہ دل کش محفل اختتام پذیر ہوئی۔ (ڈاک سے)

ادبی تقریب

● بھوپال۔ برِصغیر ہندوپاک میں جدید اردو افسانہ جن ممتاز اور مقتدر قلم کاروں سے پہچانا جاتا ہے ان میں سے تین قد آور شخصیتیں آج پندرہ روزہ "صدائے اردو" کی مہمان ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی، اقبال مجید اور رتن سنگھ ان افسانہ نگاروں میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں جنھوں نے پریم چند کی روایات میں توسیع بھی کی ہے اور ساتھ ہی ترقی پسند تحریک اور جدید افسانوی تقاضوں کو بھی اپنے فن میں برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ادیب ہر عہد اور ماحول میں نمایاں رہتے ہیں۔ متذکرہ خیالات کا اظہار عشرت قادری نے پندرہ روزہ "صدائے اردو" بھوپال کی جانب سے آراستہ کیے گئے ایک اعزازی اور استقبالیہ جلسے میں کیا جو ڈاکٹر مظفر حنفی، اقبال مجید اور رتن سنگھ کی بھوپال آمد پر منعقد کیا گیا تھا۔

جلسے کے آغاز میں "صدائے اردو" کے معاون مدیر مصطفےٰ تاج نے اپنا طنزیہ "میں بکنے کو تیار ہوں" اور افسانہ نگار نعیم کوثر مدیر "صدائے اردو" نے اپنی تازہ کہانی "اتائی جیت" پڑھ کر سنائی۔ دوسری کہانی "ایک ضروری کام" جناب رتن سنگھ نے سنائی۔ نثری دور کے بعد بساطِ سخن ترتیب دی گئی جس میں عشرت قادری، ظفر نسیمی، وحید پرواز، کامل بہزادی، رہبر جونپوری، شفق تنویر، ارمان اکبر آبادی، اختر وامق، پروین صبا، ممتاز صدیقی اور ہما کانپوری نے اپنی تازہ تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔

جلسے کے صدر اقبال مجید سے سامعین کو امید تھی کہ اپنی تازہ کہانی سنائیں گے لیکن انھوں نے سب کو چونکا دیا اور خلافِ امید دو نظمیں سنائیں جن میں موجودہ دور کی دہشت، بربریت اور بہیمت کو فنی لوازم، اشاریت اور استعاروں میں بیان کیا گیا۔ رتن سنگھ نے بھی کہانی کے علاوہ اپنے کچھ دوہے سنائے۔ (ڈاک سے)

عظیم اختر کو اردو اکادمی کے سکریٹری کا اضافی چارج

● نئی دہلی، 6/مئی۔ معروف طنز و مزاح نگار عظیم اختر کو دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری کا اضافی چارج دیا گیا ہے۔ وہ فوڈ اینڈ سپلائی محکمے میں شمالی ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ اس سے پہلے بھی عظیم اختر کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ انھوں نے متعدد طنزیہ مزاحیہ مضامین اور شخصی خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ خاکوں کا ایک مجموعہ "میری بستی میرے لوگ" کے عنوان سے شائع ہونے والا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

متفرقات

● شملہ۔ 20/مارچ کو شملہ میں ہماچل سرکار کے بھاشا و سنسکرتی وبھاگ کے زیرِ اہتمام بزمِ افسانہ منعقد کی گئی جس کی صدارت صفِ اوّل کے افسانہ نگار جناب شرون کمار ورمانے کی۔ بزم کا افتتاح انگریزی اور ہندی کے معروف ادیب جناب پی سی کے پریم ڈپٹی کمشنر ضلع شملہ نے شمع جلا کر کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے ہندی اور اردو میں ناول اور افسانے کی روایت اور بیسویں صدی میں اس کی پیش رفت کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ہماچل اور قریبی صوبوں سے تشریف لائے ادیبوں کا خیر مقدم کیا۔ بزمِ افسانہ کی نظامت کے فرائض بھاشا و سنسکرتی وبھاگ کے سہ ماہی اردو جریدے "جدید فکر و فن" کے ایڈیٹر ڈاکٹر شباب للت نے سرانجام دیے۔

پہلے اجلاس میں پنچکولہ سے تشریف لائے جناب راجندر ورمانے اپنا افسانہ "احساس" پیش کیا۔ ان کے بعد چنڈی گڑھ سے مدعو ڈاکٹر رینو بہل نے اپنا افسانہ "سراب" پڑھا۔ مس رینو بہل پنجاب کی پہلی ہندو خاتون ہیں جنھوں نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور صنفِ افسانہ کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ لنچ کے وقفے کے بعد دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر جوگ راج پرنسپل اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر سولن نے اپنا افسانہ "بے زبان کی بددعا" پیش کیا۔ آخر میں صدرِ اجلاس جناب شرون کمار ورمانے اپنا تازہ افسانہ "گڈی" پڑھا۔

ان چاروں افسانوں پر سیر حاصل تنقیدی بحث ہوئی جس میں شملہ کے ممتاز ادبا ڈاکٹر تلسی رمن، شری امرناتھ والیہ، ڈاکٹر کے سی دوبے، شری رتن سنگھ ہمیش، شری کرشن کمار طور، شری نثار شملوی، شری اشوک ہنس اور ڈاکٹر لطیف نے حصہ لیا۔ ڈائرکٹر بھاشا و سنسکرتی وبھاگ محترمہ انیتا ٹیکٹا نے مہمانوں اور شرکائے بزم کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● مالیر کوٹلہ۔ گذشتہ دنوں افسانہ کلب مالیر کوٹلہ کی جانب سے ایک افسانوی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز کے سربراہ اور نامور شاعر و نقاد ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے فرمائی۔ اس نشست میں پانچ افسانے پڑھے گئے۔ ارشد نعیم نے 'بیٹا'، سالک جمیل نے "نئی سمت"، شاہد مظفر پوری نے "فتویٰ"، پروفیسر راحت جعفری نے "حساب" اور محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے "بچاؤ" عنوانات کے تحت افسانے پڑھ کر سنائے جن پر حاضرین نے تنقیدی آرا پیش کیں۔ ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ انھیں اس نشست میں تمام افسانے سن کر بے حد خوشی ہوئی کیوں کہ وہ عشق و محبت اور رومانس سے پاک اور عصری مسائل سے متعلق تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ فسادات سے

متعلق افسانوں کی اہمیت فوراً شائع ہونے میں ہے۔ موصوف نے فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے بہت سے قیمتی نکات منکشف کیے۔ اس مجلس کی نظامت کے فرائض کلب کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● بودھ گیا، 30؍اپریل شعبۂ اردو مگدھ یونی ورسٹی گیا میں شریمتی سُنیتا سِنّی کے تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی بعنوان "بچوں کی کہانیوں کو شفیع الدین نیر کی دین" کے زبانی امتحان کے لیے تشریف لائے ہوئے مہمان ممتحن ڈاکٹر سید شاہ محمد طلحہ رضوی برقؔ، سابق پروفیسر صدر شعبۂ اردو ویر کنور سنگھ یونی ورسٹی آرہ (بھوجپور) کے ساتھ "عہد حاضر میں اردو کی معنویت" پر ایک پُر مغز گفتگو ہوئی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر ڈاکٹر محفوظ الحسن نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر برقؔ نے نہایت بلیغ اور جامع انداز میں عہدِ حاضر میں اردو کی معنویت پر روشنی ڈالی اور یہ بھی فرمایا کہ اردو کی ہر دلعزیزی کی جڑیں عربی فارسی میں نہیں ہیں بلکہ عوامی ابلاغ سے وابستگی میں پیوست ہیں۔ اس گفتگو میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے علاوہ پالی، ہندی اور انگریزی کے اساتذہ کے ساتھ ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز بھی موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● بھوپال۔ گذشتہ دنوں "بزم ڈاکٹر اقبال" کے انتخابات عمل میں آئے جس میں متفقہ طور پر جاوید یزدانی کو صدر منتخب کیا گیا، نیز صنعت کار راجیندر سنگھ اور سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری زین الدین شاہ کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اقبال بیدارؔ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے جبکہ ڈاکٹر اوصاف شاہمیری خرمؔ سکریٹری نشر واشاعت۔ جاوید اقبال فاروقی خازن اور رضا رامپوری نگراں منتخب ہوئے۔ اسی ضمن میں ایک شاندار پروگرام منعقد کیا گیا اور شہر کے ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● دہلی۔ ادارۂ ادب اسلامی کی ماہانہ شعری نشست، دفتر ماہنامہ "پیش رفت" دہلی میں زیرِ صدارت جناب عزیزؔ بگھروی ہوئی۔ نظامت کے فرائض اردو کے معتبر شاعر جناب قمرؔ سنبھلی نے انجام دیے۔ نشست کا آغاز عزیزؔ بگھروی کی نعت پاک سے ہوا۔ درج ذیل شعرا کرام نے نشست میں شرکت فرمائی:

عزیزؔ بگھروی، وقارؔ مانوی، انتظار نعیم، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، قمرؔ سنبھلی، ڈاکٹر عبیدالرحمان، احمدؔ بگھروی، شاکر علی شاکرؔ، وقارؔ کیفی، حبیب عاصم دہلوی۔ شعری نشست کے اختتام پر جناب محسنؔ شمسی نے اپنا افسانہ پڑھ کر سنایا جسے سامعین نے پسند کیا۔ صدر محفل جناب عزیزؔ بگھروی نے شعرا کرام کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

غالب اور ہماری تحریکِ آزادی

● ممبئی، 19؍اپریل۔ "شمیم طارق ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں اور ان کی تصنیف "غالب اور ہماری تحریکِ آزادی" نہایت اہم اور بحث انگیز تصنیف ہے جو غالبیات میں بحث کے نئے دروازے کھولتی ہے۔ ادب کی دنیا مذہب کی دنیا نہیں ہوتی اور ادب میں جتنے اختلافات ہوتے ہیں اتنے ہی نئے مباحث سامنے آتے ہیں۔" ان خیالات کا اظہار معروف نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انجمن اسلام کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریبِ اجرا میں کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریر میں اس کتاب پر تنقیدی نظر سے نہایت عالمانہ بحث کی اور موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا کہ اس کتاب میں جو مواد جمع کیا گیا ہے وہ بہت عالمانہ ہے اور عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے، البتہ جو نتائج اخذ کیے گئے ان میں ہر شخص کا اپنا نقطۂ نظر ہو سکتا ہے۔ تحقیق میں اختلاف ہونا اچھی بات ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ میرے خیال میں غالب کے شعروں میں آزادی کی تڑپ موجود ہے۔ ایک قطعہ اور خطوط میں 1857 کی تباہی کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہ حقیقت مدِنظر رکھنی چاہیے کہ غالب نے کہیں بھی مجاہدِ آزادی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ شاعر تھے اور ان کی زندگی کا انحصار نوابوں اور رئیسوں کی داد و دہش پر تھا، ذاتی زندگی میں وہ بہت لبرل تھے۔

پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ مجموعی طور پر شمیم طارق کی کتاب حوصلہ مندی اور عرق ریزی کی مثال ہے جس میں اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت زیادہ مواد ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالبیات اور اقبالیات اتنے وسیع میدان ہیں کہ جس میں مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر اور کالی داس گپتا رضا نے اپنی پوری عمر صرف کر دی ہے۔ شمیم طارق نے اس میدان میں قدم رکھتے ہی ادبی بحث کا ایک ایسا دروازہ کھولا ہے جس پر زمانہ برسوں داد دیتا رہے گا۔

جناب شمیم طارق نے کہا کہ غالب بے مثال شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ میں نے جنگ آزادی کے پس منظر میں انھیں کے معروضی مطالعے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ وہ تنہا ایسے شاعر ہیں جن کی آزادی، احتجاج اور انکار کے شاعر ہونے کی بات کہی جاتی ہے، جنھوں نے نثر یعنی خطوط میں اپنے اور اپنے زمانہ کے احوال لکھے ہیں، 1857 کا روزنامچہ لکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

تقریبِ اجرا کی صدارت سابق ریاستی وزیر اور انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے کی اور خوشی کا اظہار کیا کہ ایک عالمانہ اور تحقیق

کتاب انجمنِ اسلام کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے شائع کر کے اپنی علمی تحقیقی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ (ڈاک سے)

شبِ تار

● دہلی۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار بلراج ورما کی تازہ تصنیف "شب تار" کی رسمِ اجرا 6/ اپریل و غیر رسمی انداز میں اُن کے مکان واقع میور وہار دہلی میں منعقدہ ایک خوبصورت اور یادگار محفل میں انجام پائی۔ ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال نے صدارت فرمائی اور بین الاقوامی شہرت کے دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رسمِ اجرا انجام دی۔

پروفیسر عتیق اللہ صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی نے "شب تار" کے کرداروں اور ان کی نفسیات سے بحث کی اور اسے بلراج ورما کے فن کا ایک دلچسپ مرقع بتایا۔

جناب پیغام آفاقی نے کہا کہ بلراج ورما کی تحریروں کے علاوہ اُن کی نجی زندگی میں بھی صلح کل، سیکولرازم، انسان دوستی اور گنگا جمنی تہذیب کے عناصر پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ یہی وصف ایک اچھے انسان اور سچا فنکار ہونے کا ثبوت ہے۔ جناب ابوالفیض سحر نے بلراج ورما کو اردو تہذیب کا نمائندہ اور ان کی کہانیوں کو سماجی تناظر میں انسانی احساسات و جذبات کا شگفتہ، رواں اور شفاف اظہار بتایا۔

جناب رفعت سروش نے بلراج ورما کو ایک شریف النفس انسان اور سچا فنکار بتاتے ہوئے ان کے ناولٹ "شب تار" کے موضوع اور کرداروں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اُن کے کردار ہمارے سماج کے جیتے جاگتے افراد ہوتے ہیں جن میں خود خالق کی شخصیت جھلکتی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ملک زادہ جاوید عازم کوہلی اور جناب کلدیپ گوہر نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بلراج ورما کی شخصیت، اُن کے فن اور اُن کی علمی و ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہوئے انھیں صاف ستھرے اور سلجھے ہوئے ذہنی مزاج اور کردار کا بلند حوصلہ فنکار قرار دیا۔ 'تناظر' کے حوالے سے مزید بتایا کہ بلراج ورما کی ادبی خدمات، ادبی صحافت اور افسانوی نگارشات کا ابھی تک صحیح ڈھنگ سے پورا اعتراف نہیں ہو سکا ہے۔

جناب جوگندر پال صدر جلسہ نے اپنی مختصر صدارتی تقریر میں بلراج ورما کی اردو افسانوی ادب سے گہری، دیرینہ اور پُرخلوص وابستگی کو ان کی دیانتِ احساس کی ایک تابندہ مثال قرار دیا۔ محترمہ شگفتی ورما نے خلوصِ دل سے بلراج ورما کی انسان دوستی، عرفانِ حیات اور محبت و اخوت کے احساسات و جذبات کو اُن کی شخصیت کے جوہر اور اُن کی پہچان کے نشان بتایا۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ریڈر دہلی یونی ورسٹی نے نظامت کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیے اور اس غیر رسمی تقریب کو عزت و وقار بخشنے اور اسے ہر اعتبار سے کامیاب بنانے میں سبھی مقررین اور شرکائے محفل کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

کیفِ رشید

● ناگپور۔ "عبدالرشید کیفی نے ترقی پسند تحریک کے مجوزہ موضوعات سے اپنے آپ کو بچائے رکھا جبکہ ان کے ہم عصروں پر اس کے زبردست اثرات مرتب ہوئے، اس کے باوجود کیفی کی شاعری میں اُن کے عہد کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے علاقے کے مقبول شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔" عبدالرشید کیفی کے مجموعۂ کلام "کیف رشید" کی رسم اجرا کے موقع پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر سید یونس نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر کی مرتب کردہ اس کتاب کی رسم اجرا ڈاکٹر سید رفیع الدین کے ہاتھوں ایک پُروقار تقریب میں عمل میں آئی جس کا اہتمام ایک ادبی تنظیم "دبستان" نے کیا تھا۔

تقریب میں ڈاکٹر خلشاء الرحمن خان خلشا، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، پربھاکر مارڈیکر، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن اور فہیم الدین بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ ان میں سے چند ادیبوں نے کتاب کے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ عبدالصمد قیصر نے ساز کے ساتھ عبدالرشید کیفی کا منتخب کلام ترنم سے پیش کر کے سامعین کو مسحور کیا۔

معروف تاریخ داں اور محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ضیاء الدین دیسائی کے سانحۂ ارتحال پر ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن نے اُن کے حالات زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور ایک تعزیتی قرارداد پیش کی۔ ڈاکٹر اشفاق احمد نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور مجیب صدیقی نے ہدیۂ تشکر ادا کیا۔ (ڈاک سے)

"جمناتٹ" کا زار علامی نمبر

● پنچکولہ۔ ہریانہ کے اردو ادب میں ڈاکٹر زار علامی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ زار صاحب ایک شاعر ہی نہیں ایک ادیب، ایک شفیق استاد اور ماہر عروض تھے۔ اردو شعر و ادب پر زار صاحب نے نصف درجن کتابیں تحریر کی ہیں جنھیں مختلف ادبی اداروں سے انعامات سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر زار علامی کا تعلق ہریانہ کے مقام سدھورا ضلع انبالہ سے تھا۔ انھیں ہریانہ اردو اکادمی سے خاص لگاؤ تھا اور اکادمی کی تقریبات میں وہ خصوصیت سے شرکت کرتے تھے۔ زار صاحب کو ان کی خصوصی ادبی خدمات کے لیے اکادمی کی

جانب سے ریاستی سطح کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

اکادمی کی جانب سے اس کے سہ ماہی مجلے "جمناتٹ" کا ڈاکٹر زار علامی نمبر شائع کیا گیا ہے جس کی رسم اجرا وزیر تعلیم ہریانہ جناب بہادر سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر وزیر تعلیم نے کہا کہ ڈاکٹر زار علامی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اردو ادب کا وہ خزانہ چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ اس موقع پر کمشنر و سکریٹری تعلیمات اور اکادمی کے نائب صدر جناب پی کے چودھری نے بھی خطاب کیا۔

اس سے قبل اکادمی کے سکریٹری جناب رمیندر جاکھو ساحل آئی اے ایس نے زار علامی کی ادبی خدمات کا ذکر کیا اور مستقبل قریب کی اسکیموں کے تعلق سے کہا کہ اکادمی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہریانہ کے وہ دوسرے قلمکار جو اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، ان پر اس طرح کے مزید خاص نمبر شائع کیے جائیں گے۔

تقریب رسم اجرا کے اس موقعے پر پنجابی یونی ورسٹی میں اردو کے لیکچرر ڈاکٹر ناشر نقوی نے ڈاکٹر زار پر اپنا تنقیدی اور تحقیقی مقالہ پڑھا اور خاص طور سے عروض کے میدان میں زار صاحب کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس دوران زار صاحب کی ادبی خدمات اور ان کے فکری نظریے کے تعلق سے بہت خوشگوار گفتگو بھی ہوئی جس میں ڈاکٹر کمار پانی پتی، ڈاکٹر گوپال کرشن شفق، ڈاکٹر چندر ترکھا، میجر اے ایس شیر گل (ریٹائرڈ) اور دوسرے بہت سے مقامی قلمکاروں نے حصہ لیا۔ تقریب کی نظامت کے فرائض اکادمی کے ایڈیٹر شمس تبریزی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

اردو میلہ

● ناگپور۔ 31 مارچ کی شب، ناگپور کے نوجوان مزاح نگار انصاری اصغر جمیل کی ادارت میں ماہنامہ "اردو میلہ" کا اجرا مہاراشٹر کالج ممبئی کے سابق صدر شعبۂ فارسی اور کئی کتابوں کے مصنف نیز صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر نورالسعید اختر صاحب کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف محقق، نقاد، ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل صاحب نے فرمائی جبکہ مہاراشٹر کے وزیر مملکت برائے اعلیٰ و تکنیکی تعلیمات حاجی انیس احمد معزز مہمان کی حیثیت سے شریک تھے۔

ناظم تقریب محمد غلام رسول اشرف صاحب نے انصاری اصغر جمیل کی ادارت میں 1984 میں جاری کیے گئے "مزاح نامہ" اور ان کی تصنیف "گگی" نیز ان کی تالیفات "کنگن" اور "مشاہیر کے خطوط۔ ڈاکٹر ساحل کے نام" کا مختصر تعارف پیش کیا۔ پھس کے ادیب وکیل نجیب صاحب نے اس موقع پر اپنا مقالہ پیش کر کے اردو رسائل کے ساتھ اردو والوں کی بے توجہی کا اظہار طنزیہ و مزاحیہ انداز میں کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر منشاءالرحمن خاں منشا نے اپنے شاگرد انصاری اصغر جمیل کی سیمابی کیفیت اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور "اردو میلہ" جاری کرنے پر انھیں دلی مبارک باد پیش کی۔ حاجی انیس احمد، وزیر مملکت برائے اعلیٰ و تکنیکی تعلیمات حکومت مہاراشٹر نے انصاری اصغر جمیل کو "اردو میلہ" جاری کرنے پر مبارک باد دیتے ہوئے انھیں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں انصاری اصغر جمیل سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر دو ماہی قرطاس کے مدیر محمد امین الدین اور کارپوریٹر حاجی محمد صابر مہمانان اعزازی کی حیثیت سے شریک تھے۔ انصاری اصغر جمیل نے اپنے ہدیۂ تشکر میں ناگپور کی اردو برادری کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔

بعد ازاں معروف شاعر جناب ظفر کلیم صاحب کی صدارت میں شعری محفل کا آغاز ہوا جس کی نظامت کلیم احمد نے نہایت عمدگی سے انجام دی۔ اس محفل میں درج ذیل شعرا نے اپنا کلام پیش کیا:

اشتیاق عابد، نعیم انصاری، عشرت بلال، نسیم ناگپوری، کریم گہر، عابد حسین عابد، حمید انصاری، محفوظ اثر، کلیم الدین شاد، جاوید ندیم، اسحاق اکمل، رحمت اللہ راشد، امیر اللہ عنبر، صبا غزنوی، حمید دانش، خضر ناگپوری اور ڈاکٹر منشاءالرحمن منشا۔

وفیات

کیفی اعظمی

● ممبئی، 10 مئی۔ مشہور انقلابی شاعر کیفی اعظمی کا آج صبح ممبئی کے جسلوک اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ 80 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیٹی شبانہ اعظمی اور بیٹا بابا اعظمی شامل ہیں۔

قریب پانچ دہائیوں سے فلمی گیتوں اور انقلابی شاعری کی قد آور شخصیت مانے جانے والے اطہر حسین رضوی کیفی اعظمی کے انتقال کے ساتھ آج اس دور کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ کیفی اعظمی نے گیارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی غزل لکھی تھی۔ کیفی اعظمی کو اپنے کمیونسٹ نظریات کی وجہ سے دو بار جیل بھی جانا پڑا۔ ٹریڈ یونین کے کارکن کے طور پر 1943 میں جب وہ ممبئی پہنچے تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ شخص ایک دن شاعری کی بلندی پر پہنچ جائے گا۔ انھوں نے ممبئی میں ہندستان کیمونسٹ پارٹی کے اردو روزنامے "قومی جنگ" میں کام کیا۔ ڈرامہ آرٹسٹ محترمہ شوکت سے شادی کے بعد کیفی نے فلموں میں گیت لکھنے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور 1948 میں لطیف کی

فلم بزدل کے لیے انھوں نے اپنا پہلا گانا لکھا۔ جن دیگر فلموں کے لیے انھوں نے گانے لکھے، انوپما، ہنستے زخم، شعلہ اور شبنم، پاکیزہ، شگن، حقیقت، ہندستان کی قسم، نصیب، ارتھ، پھر تیری یاد آئی اور تمنا ان میں شامل ہیں۔

گرم ہوا اور ہیر رانجھا کے اپنے منظر نامے اور ڈائیلاگ کے لیے فلمی دنیا انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ انھیں حکومتِ ہند نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے اردو کے ساتھ فرق و امتیاز برتے جانے پر اظہارِ احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے پدم شری کا اعزاز واپس کر دیا تھا۔ کیفی اعظمی اتر پردیش میں مجواں ضلع اعظم گڑھ میں 1925 میں پیدا ہوئے۔ 1942 کی ہندستان چھوڑو تحریک میں انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور زنداں کی زندگی کو لبیک کہا۔ وہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور انھوں نے اپنی زندگی ہندستانی محنت کشوں اور غریبوں کی جدوجہد میں شرکت کے لیے وقف کر دی تھی۔ کیفی اعظمی کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے جن کے نام ہیں "جھنکار، آخرِ شب اور آوارہ سجدے"۔ ان کو آوارہ سجدے پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ دیا گیا۔ کیفی اعظمی کو نہرو سویت لینڈ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ہندستان پر چین کے حملے کے بعد محمد رفیع کا گایا ہوا ان کا یہ نغمہ مدتوں فضاؤں میں گونجتا رہا۔

آج ہمالیہ کی چوٹی سے یہ ہم نے للکارا ہے
جاگ اٹھو اے دنیا والو ہندستان ہمارا ہے

فرقہ واریت، تنگ نظری اور تعصب کے خلاف ان کی نظمیں خانہ جنگی، بہروپنی، چراغاں اور عوام بہت مشہور ہوئیں۔ (یو این آئی)

عبداللطیف اعظمی

● نئی دہلی، 11/ مئی۔ اردو کے بزرگ نقاد اور اسکالر عبداللطیف اعظمی کا آج دہلی کے ذاکر نگر میں ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ وہ 85 برس کے تھے۔ پسماندگان میں چار بیٹے، ایک بیٹی اور داماد ہیں۔ اعظمی صاحب کئی سال سے علیل تھے۔ تقریباً تمام عمر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ رہے۔

عبداللطیف اعظمی مارچ 1917 میں اعظم گڑھ کے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ندوۃ العلماء اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہ وائس چانسلر کے او ایس ڈی اور رسالہ جامعہ کے مدیر بھی رہے۔ جناب اعظمی تقریباً 25 کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شبلی کا مرتبہ ادب میں" ان کی مشہور کتاب ہے۔ انھوں نے شخصیات پر کئی ضخیم کتابیں لکھیں جن میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ ان میں کئی شخصیتوں کو انھوں نے خود بھی قریب سے دیکھا تھا۔ دہلی اردو اکادمی سے شائع ہونے والی اردو کے ادیبوں، شعرا اور مصنفین کی بے حد ضخیم ڈائرکٹری مرتب کرنے میں بھی ان کا اہم رول تھا۔ 1930 میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد سے حالیہ برسوں تک کی خدمات پر بھی انھوں نے ایک اہم کتاب لکھی تھی جسے کافی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

● احمد آباد۔ ماہر آثار قدیمہ اور مرکزی حکومت کے ادارہ برائے کتبہ شناسی ناگپور کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کا 24/ مارچ 2002 کو ان کے آبائی وطن احمد آباد (گجرات) میں انتقال ہو گیا۔ پس ماندگان میں اہلیہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی 18/ مئی 1925 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ فارسی زبان و ادب کے معروف فاضل اور عہدِ وسطیٰ کی تہذیبی تاریخ کے ماہر تھے۔ انھوں نے پورے ملک میں واقع آثار قدیمہ کے عربی و فارسی کتبات کی نقول ادارے کے مجلّے میں شائع کر دی تھیں۔ ہندستان کی قدیم مساجد اور اہم دینی مدارس ان کی مقبول انگریزی کتابیں ہیں جن کے ترجمے اردو اور ہندی میں بھی ہوئے۔

(ہفت روزہ "ہماری زبان"، نئی دہلی)

صہبا لکھنوی

● بھوپال، 22/ اپریل۔ اردو کے ادبی رسالے، ماہنامہ "افکار" بھوپال، (کراچی) کے مالک و مدیر جناب صہبا لکھنوی کا 82 سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہو گیا۔ صہبا لکھنوی بھوپال کے اُن باشعور اور ہوشمند قلم کاروں میں شامل تھے جنھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں پہل کی اور اس تحریک کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صہبا لکھنوی کی بود و باش تعلیم و تربیت بھوپال ہی میں ہوئی اور پاکستان ہجرت کرنے سے کچھ عرصے پہلے تک وہ جہانگیریہ اسکول میں مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ قیام کے بعد انھوں نے انجمن اور جدید ادبی رجحانات کے ترجمان کے طور پر 1945 میں ماہنامہ "افکار" جاری کیا اور بھوپال کو غیر منقسم ہندستان کے ادبی نقشے پر نمایاں کرنے میں پُر خلوص خدمات انجام دیں۔ اسی طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس جو 1949 میں منعقد کی گئی تھی، اس میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 1948-1949 میں بھوپال ہی سے لکھنؤ کانفرنس، بھوپال کانفرنس کے علاوہ کشمیر کانفرنس کے ضخیم نمبرات شائع کیے۔

'افکار' کی دوسری اشاعت کا دور 1951 میں کراچی سے شروع کیا جہاں سے متعدد خصوصی شمارے شائع کیے جن میں خاص طور پر افسانہ نمبر، سالنامہ، دس سالہ نمبر، منٹو نمبر، مجاز نمبر، سالگرہ نمبر، آزادی نمبر، جوش نمبر، حفیظ نمبر، فیض نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، امیر خسرو، ایڈیشن اور کرشن چندر نمبر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ (ندیم، بھوپال)

ڈاکٹر ابو محمد سحر

● نئی دہلی، یکم مئی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے انتقال پر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر عہد رواں کے نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت استاد بے حد مقبول تھے اور شعر و ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ جہاں تک زبان اور املا کا تعلق ہے اس اعتبار سے وہ قواعدیات کے عالم تھے۔

اس موقع پر پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر ادب کا پختہ شعور رکھتے تھے اور اعلیٰ قدروں کے پاسدار بھی تھے۔ پروفیسر فیروز احمد (بے پور) نے ڈاکٹر سحر کو ایک علم دوست اور اخوت و محبت کا علم بردار بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی موت سے اس عہد کا سچا خادمِ اردو ہم سے جدا ہو گیا۔ ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

عثمان اسد

● اردو کے مشہور و ممتاز صحافی اور ہفت روزہ "نشیمن" بنگلور کے اڈیٹر جناب عثمان اسد کا طویل بیماری کے بعد 11/مارچ 2002 کو مہاویر جین اسپتال بنگلور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ، تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ وہ ایک بے باک صحافی اور مجاہد آزادی تھے اور تاحیات اردو صحافت سے وابستہ رہے۔

اسد صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ "پاسبان" سے کیا تھا۔ 26/جنوری 1962 کو اپنا ذاتی اخبار "نشیمن" جاری کیا جو چالیس برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ (ہفت روزہ "ہماری زبان"، نئی دہلی)

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़–ए उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Ph.: 6109746, 6169416 Fax: 6108159 E-mail: urdueducation@hclinfinet.com

کتابوں کی نمائش و فروخت آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں

موبائل وین سے اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کے تجربے میں ہمارے اردو قارئین نے جس جوش و خروش سے کتابیں خریدیں اور کتب بینی کی روایت میں نئی روح پھونکی اس نے کونسل کے ولولے دوبالا کیے ہیں۔ اتر پردیش کی دور دراز اردو بستیوں میں آپ کے ہاتھوں تک اردو کا سرمایہ پہنچانے کے لیے یہ موبائل وین اب حسبِ ذیل پروگرام کے مطابق آپ کی بستی میں پہنچے گی:

20 تا 22 مئی	سیتاپور	1 تا 2 جون	بستی	10 تا 12 جون	اعظم گڑھ
23 تا 25 مئی	بہرائچ	3 تا 4 جون	ٹانڈا	13 تا 15 جون	مئو
26 تا 28 مئی	گونڈا	6 تا 7 جون	اکبرپور	16 تا 17 جون	غازی پور
29 تا 31 مئی	فیض آباد	8 تا 9 جون	سلطان پور	18 تا 19 جون	جونپور

نوٹ: شناختی کارڈ دکھانے پر اساتذہ اور طلبہ کے لیے 40% رعایت

تبصرہ و تعارف

قدیم ہندستان کی تاریخ / رام شنکر تر پاٹھی

مترجم: سید یحیٰ حسن نقوی

580 صفحات، -/114 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ملک راشد فیصل

اردو زبان میں جدید سائنٹفک علوم پر کتابیں عموماً دستیاب نہیں ہیں اور جو ہیں وہ تراجم کی مدد سے اردو داں طبقے تک پہنچ سکی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم بالعموم انگلش اور ہندی رہتا ہے۔ چنانچہ طلبہ مختلف شعبوں میں ان علوم کا مطالعہ ان زبانوں میں ہی کرتے ہیں۔ ریسرچ اسکالر اپنی تحقیقات بھی انھی زبانوں میں کرتے ہیں اور نتیجتاً کتابیں بھی انھی زبانوں میں منظر عام پر آتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کا دائرہ محدود ہے اس لیے یہ زبان متعدد علوم سے محروم رہ جاتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ادب کے علاوہ دیگر علوم و فنون کو اردو زبان میں فروغ دیا جائے۔ یہ اردو داں طبقے کی خوش نصیبی ہے کہ قومی کونسل کے توسط سے متعدد کتابیں تراجم کی صورتوں میں ان تک پہنچ رہی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"قدیم ہندستان کی تاریخ" مشہور تاریخ نگار رام شنکر تر پاٹھی کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ تاریخ کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے کیوں کہ تاریخ کے آئینے میں ہم اپنے عہد ماضی کو دیکھ سکتے ہیں۔ آج کی تیزی سے بدلتی دنیا میں بھی ہم اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کرسکتے کیوں کہ مختلف مواقع پر گھبرا کر ہم ماضی کے واقعات میں پناہ لیتے ہیں اور ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی بھی مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ تاریخی حقائق کو جوں کا توں بیان کردے اور کہیں بھی جانبداری سے کام نہ لے۔ مورخ نہ تو خیالات و نظریات کا مبلغ ہوتا ہے اور نہ قدیم حکمرانوں کے کارناموں کا قصیدہ خواں۔ قدیم ہندستان کی تاریخ لکھتے وقت مورخ کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ ہزاروں سال بعد شواہد واسناد مبہم، غیر یقینی اور نامکمل ہو جاتے ہیں اور بعض متبائن اور متضاد بھی۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے ان تمام مشکلات کو غیر جانبداری کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

کتاب میں قدیم ہندستان کی تاریخ، معاشرت اور اداروں کا حال، ہندستانی تاریخ کے ابتدائی دور سے لے کر مسلمانوں کی حکومت کے قیام تک کے حالات وواقعات مذکور ہیں۔ یہ کتاب 580 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مضامین کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ کتاب کو چار حصوں اور انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب میں فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چھوٹے چھوٹے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ اس طرح قارئین اپنی ضرورت اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے موضوعات کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ مختلف نکات کی وضاحت کے لیے حاشیوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے معلومات کے تمام ذرائع ادبی اور اثری (کتبے، سکے، عمارتیں) کی اچھی طرح چھان بین کی ہے اور انھیں بہ شکل احسن پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ مختلف موضوعات اور مختلف ادوار پر جو جدید ترین تحقیقات ہوئی ہیں، انھیں احتیاط کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے حصہ اوّل کا باب اوّل مآخذ کے بیان پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں قدیم حجری عہد، نوحجری عہد، دھاتوں کے ظہور، معدنیاتی عہد کا ذکر اختصار کے ساتھ ہے۔ تیسرے باب میں رگ ویدی عہد کے ذیل میں آریوں اور ان کے رہن سہن کا بیان ہے۔ انیسویں اور آخری باب میں قرون وسطیٰ کے اوائل میں شمالی ہندستان کی سیاسی حالت، جنوبی ہندستان میں ریاستوں کے عروج و زوال، مذہب اور سماج، انتظام حکومت اور اقتصادی حالات اور ادب و فن کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کتاب کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ قدیم ہندستان کی تاریخ کے موضوع پر یہ ایک مکمل اور مبسوط کتاب ہے۔

کتاب کے مترجم سید یحیٰ حسن نقوی کی عرق ریزی اور جانفشانی کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ تبصرہ نامکمل ہوگا۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے لیکن مترجم نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا ہے۔ انھوں نے خالص تاریخی اصطلاحات اور اسما کے تلفظات کو آسان بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ مصطلحات بھی شامل کی گئی ہے۔ امید ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

امراض الاطفال / حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

560 صفحات، -/92 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: فیروز عالم

بچے عالم انسانیت کا مستقبل ہوتے ہیں جسے تابناک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی بہتر نگہداشت کی جائے، ان کی پرورش و پرداخت میں حد درجہ احتیاط برتی جائے، ان کے خورد و نوش کا خصوصی خیال رکھا جائے اور بیمار ہونے کی صورت میں ان کی بہتر دیکھ بھال کی جائے اور ان کی صحت و تندرستی پر پوری توجہ دی جائے۔ زیرِ نظر کتاب "امراض الاطفال" اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں بچے کی ولادت سے دس بارہ سال کی عمر تک ہونے والی بیماریوں، ان کی تشخیص، علاج، غذا، پرہیز، احتیاط اور دواؤں وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی ہیں۔ مصنف نے کتاب کو انیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان ابواب میں ولادت کے وقت روا رکھی جانے والی احتیاطی تدابیر، نوزائیدہ کو دی جانے والی غذا، امراض کی تشخیص، بچوں کے دماغی و اعصابی امراض، منہ، آنکھ، ناک، کان، حلق اور زبان کی بیماریوں، امراضِ تنفس، قلب، معدہ، امعا، مقعد، فسادِ خون اور چیچک، خسرہ جیسی وبائی بیماریوں کی وجوہات، تشخیص اور علاج پر کافی معلوماتی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلے باب میں مصنف نے ولادت کے بعد بچے کی ناف کاٹنے سے لے کر وقفے وقفے سے لگائے جانے والے ٹیکوں تک کی تفصیل درج کی ہے۔ ایک جدول بھی دیا گیا ہے جس میں بچے کی عمر کے حساب سے اس کا وزن مقرر کیا گیا ہے۔ بچوں کے دانت نکلنے کے وقت کی پریشانیوں سے بچنے کے لیے چند اہم نسخے مصنف نے تحریر کیے ہیں۔ نوزائیدہ بچوں کو پلائے جانے والے دودھ کی اہمیت، دودھ چھڑانے کا مناسب وقت اور اس کی متبادل غذا، بچوں کی مختلف بیماریوں کی تشخیص کا طریقۂ کار اور معالجین کے لیے نہایت اہم ہدایات حکیم صاحب نے اس باب میں رقم کی ہیں۔

دوسرے باب میں حکیم صاحب نے دماغی اور اعصابی امراض مثلاً سرسام، عطاش، فالج، ام الصبیان، مثلث اور خواب میں ڈرنے کی بیماریوں کے اسباب، علامات اور علاج کے طریقے اور نسخے بتائے ہیں۔

بیانِ چشم کے ضمن میں آنکھ کی مختلف بیماریوں جالا، بھینگاپن، سلاق (جس میں بچوں کے پپوٹوں کے بال جھڑ جاتے ہیں) نظر کی کمزوری، آنکھوں کی پھنسی اور خارش وغیرہ سے نجات کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ چوتھے، پانچویں ابواب میں کان اور ناک کی بیماریوں کے لیے دوائیں تحریر کی گئی ہیں۔ باب ششم میں منہ اور زبان اور ہشتم میں اعضائے تنفس سے متعلقہ بیماریوں اور ان کے علاج پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس میں التہاب، زبان، کوا لٹکنے، ٹونسل بڑھنے، ڈپتھیریا، کالی کھانسی، کھانسی، دمہ اور ٹی بی (سِپ دق) جیسی خطرناک بیماریوں سے بچاؤ کے طریقے اور مرض کا شکار ہونے کی صورت میں علاج اور پرہیز و غذا سے واقف کرایا گیا ہے۔ باب نہم امراضِ قلب پر مشتمل ہے۔ امراضِ معدہ کے باب میں مصنف نے قے، پیاس کی شدت، دردِ معدہ، نفخ شکم، ہیضہ، قبض، اسہال، پیچش، کرمِ شکم اور اپینڈیسائٹس وغیرہ بیماریوں سے نجات کے لیے دوائیں اور نسخے تجویز کیے ہیں۔ مصنف نے بچوں میں یرقان (Jaundice) کے اسباب اور اس کے علاج پر کافی معلوماتی باتیں تحریر کی ہیں۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے نہایت تفصیل سے ہر بیماری کی علامتوں اور اس کے اسباب کا ذکر کیا ہے تاکہ مرض کی تشخیص میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ زیادہ تر امراض کے مترادفات بھی مصنف نے درج کیے ہیں اور علاج کے ضمن میں یونانی مفرد و مرکب ادویہ کے ساتھ ساتھ بعض اوقات ایلوپیتھک دوائیں بھی تجویز کی ہیں۔ مصنف نے دواؤں کے مضر اثرات بھی درج کر دیے ہیں اور ہر بیماری کے متعلق لکھتے ہوئے غذا و پرہیز کے بارے میں ضرور لکھا ہے۔ آخر میں اصطلاحات کی ایک فہرست بھی شامل ہے جو بڑی کارآمد ہے۔

مصنف کی زبان بہت حد تک سادہ اور اسلوب ترسیلی ہے جو نہ صرف طبیبوں اور طب کے طالب علموں بلکہ عام شائقین کو بھی کتاب سے استفادے میں مدد دے گی۔ اتنے اہم اور وقت طلب موضوع پر کتاب لکھنے کے لیے مصنف اور شائع کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو بے حد مبارکباد۔ کتاب اپنی افادیت اور کم قیمت کے باعث ضرور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

•

رات پشمینے کی / شاعر: گلزار

256 صفحات، -/250 روپے
ناشر: اساطیر، میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور، پاکستان
مبصر: مخمور سعیدی

گلزار اوّلاً ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ ان دنوں ان کا قیام دلّی میں تھا لیکن وہ اپنے آبائی وطن دینہ کی نسبت اپنے نام کے ساتھ لگاتے تھے اور ان کے افسانے گلزار دینوی کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ یہ افسانے عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے تھے اور لکھنے والے کے نجی مشاہدے اور اس کی انفرادی سوچ کی ترجمانی کرتے تھے۔ پھر گلزار نے دلی کو خیرباد کہا، بمبئی کو اپنا مستقر بنایا اور نام کے ساتھ وطنی نسبت ترک کر کے

صرف گلزار کے نام سے فلمی صنعت سے وابستگی اختیار کرلی۔ بمبئی کی فلم نگری کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے وابستگی اختیار کرنے والے اس کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، ان کی اپنی کوئی پہچان باقی نہیں رہتی لیکن ہر کلیے میں کچھ استثنا بھی ہوتے ہیں۔ گلزار نے فارمولا فلموں کی بھیڑ میں ایسی فلمیں پیش کیں جن میں زندگی کا دل دھڑکتا تھا اور جو سلگتے ہوئے عصری حقائق کو سامنے لاتی تھیں۔ یہ فلمیں باکس آفس پر ناکام نہیں ہوئیں حالانکہ ان میں ایسا کوئی بازاری مسالہ شامل نہیں کیا گیا تھا جو عام طور پر فلموں کی کامیابی کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تیز مشاہدہ اور دردمند دل رکھنے والے فنکار کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں جو پردۂ سیمیں پر آکر زندہ اور متحرک ہوگئی تھیں۔ اپنی فلموں کے گانے بھی گلزار نے خود ہی لکھے اور یہاں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا، لفظیات میں بھی اور اپنے معنوی سروکار میں بھی یہ گانے عام فلمی گانوں سے یکسر مختلف تھے اور سننے والے کو جذبات ومحسوسات کی ایک الگ دنیا میں لے جاتے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، گلزار نے اپنا ادبی سفر افسانے سے شروع کیا تھا لیکن یہ افسانے عام ڈگر سے ہٹ کر تھے۔ ان کا امتیاز کیا تھا؟ مجھے نہیں معلوم گلزار کے افسانے کتنے لوگوں نے پڑھے ہیں لیکن جن لوگوں نے پڑھے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ یہ صرف خارجی ماحول کے عکاس نہیں تھے انسان کے باطنی احوال کو بھی سامنے لاتے تھے۔ انسان کے باطنی احوال سے یہ گہری دلچسپی ہی غالباً انھیں شاعری کی طرف لے آئی جو عصری اردو شاعری کے لیے ایک مبارک شگون تھا۔

"پکھراج کا چاند" کے بعد "رات پشمینے کی" گلزار کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں، غزلوں اور تروینیوں پر مشتمل ہے اور برگزیدہ شاعر احمد ندیم قاسمی کے پیش لفظ اور جواں سال شاعرہ منصورہ احمد کے تاثرات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ گلزار نے اس مجموعے کو انھی کی نذر بھی کیا ہے۔ تروینی تین مصرعوں پر مشتمل ایک نئی صنفِ سخن ہے جو گلزار کی اختراع ہے۔ انھوں نے اسے یہ نام کیوں دیا اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "سنگم پر تین ندیاں ملتی ہیں: گنگا، جمنا اور سرسوتی۔ گنگا اور جمنا کے دھارے سطح پر نظر آتے ہیں لیکن سرسوتی جو ٹیکسلا کے راستے سے بہہ کر آتی تھی، وہ زمین دوز ہوچکی ہے۔ تروینی کے تیسرے مصرعے کا کام سرسوتی دکھانا ہے جو پہلے دو مصرعوں سے چھپی ہوئی ہے"۔

کتاب کا آغاز نظموں سے ہوا ہے۔ پہلی دو نظمیں گلزار نے اپنی بیٹی بوسکی کے لیے کہی ہیں جو اب نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے۔ پہلی نظم ان اندیشوں کو لفظوں کا پیرہن دے رہی ہے جو اس مرحلے پر ایک محبت کرنے والے باپ کے دل میں پیدا ہوسکتے ہیں اور دوسری نظم بیٹی کی ناراضگی کے امکان کا ردعمل ہے جو بیٹی کے ساتھ باپ کے انتہائی تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ نظمیں انسانی رشتوں کے تئیں شاعر کے گہرے لگاؤ اور ان رشتوں کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے جذبے کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔

نظموں کے اس حصے میں جسے گلزار نے "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" عنوان دیا ہے۔ ایک ہی عنوان کی دو دو، تین تین، چار چار یا پانچ چھ نظمیں شامل ہیں۔ "کائنات" کے عنوان سے چار نظمیں ہیں جو کائنات کے اسرار اور ان اسرار کی بتدریج پردہ کشائی کے عمل پر ہیں۔ "خدا" کے زیرِ عنوان بھی چار نظمیں ہیں جو ایک طنزیہ آہنگ لیے ہوئے ہیں اور یہ آہنگ ان آہوں اور کراہوں سے بنا ہے جو مخلوقِ خدا کی ناکامیوں، نارسائیوں اور زمین پر اس کی ناآسودگیوں کی شکوہ سنج ہیں۔ ان نظموں میں خدا سے شاعر کا تخاطب کچھ ایسا ہے جیسے کوئی پیار اور دلار کا متمنی بچہ اپنے کسی بزرگ کے غیر متوقع برتاؤ پر حیران بھی ہو اور پریشان بھی۔

توڑ تاڑ کے "گلیکسز" کے محور تم
جب بھی زمین پر آتے ہو
بھونچال چلاتے اور سمندر کھولاتے ہو

اس سلسلے کی چوتھی نظم "پورے کا پورا آکاش گھما کر بازی دیکھی میں نے" زبان اور لفظیات کے اختلاف کے ساتھ اپنی اپروچ میں اقبال کے ان فارسی اشعار کی یاد دلاتی ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — تو گل آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

"وقت" کے زیرِ عنوان تین نظموں میں پہلی دو نظمیں وقت کی چیرہ دستیوں کے ہدف انسانی وجود کی بے بسی یا پھر اس کی جھنجھلاہٹ کو ظاہر کرتی ہیں لیکن تیسری نظم ایک فاتحانہ تاثر ابھارتی ہے۔ انسان ہی وقت کا غلام نہیں، خود وقت بھی اپنی گردشوں کا اسیر ہے اور جس طرح وقت کے شکنجے سے آدمی کی رہائی ممکن نہیں اسی طرح اپنی گردشوں کے دائرے سے باہر آنا وقت کے لیے بھی ممکن نہیں۔

غلام ہے وقت گردشوں کا
کہ جیسے اس کا غلام ہوں میں

"فسادات" کے عنوان سے چھ نظمیں فسادات کے غیر انسانی پہلوؤں کو مختلف انداز سے سامنے لاتی ہیں اور درندگی اور بربریت کے مقابلے میں شرافت اور انسانیت کی بیچارگی کا نوحہ ہیں۔

اگلے حصے کا عنوان ہے: "چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا" اس میں الگ الگ عنوانات پر الگ الگ نظمیں ہیں۔ کئی نظمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور انھیں توجہ سے پڑھا جائے تو فکر وخیال کے کئی گوشے منور ہو اٹھتے

ہیں۔ غالب کی شخصیت اور شاعری سے گلزار کو عقیدتمندانہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا اظہار زیر نظر کتاب کے ذیلی عنوانات سے بھی ہوتا ہے جن کے لیے غالب کے مصرعے مستعار لیے گئے ہیں اور اس کی ایک لازوال دین ان کا وہ مشہور سیریل ہے جو انھوں نے غالب کی زندگی اور ان کی شاعری کو سامنے رکھ کر بنایا تھا اور جس نے سچ مچ غالب کو کتابوں سے نکال کر ایک زندہ اور متحرک کردار میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس حصے میں ایک مختصر مگر تاثر سے بھرپور نظم غالب کے لیے بھی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ پوری کی پوری نظم یہاں نقل کر دی جائے:

رات کو اکثر ہوتا ہے، پروانے آکر
ٹیبل لیمپ کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں
سنتے ہیں، سر دھنتے ہیں
جب بھی میں دیوانِ غالب کھول کے پڑھنے بیٹھتا ہوں
صبح کو پھر دیوان کے روشن صفحوں سے
پروانوں کی راکھ اٹھانی پڑتی ہے

نظموں کے بعد غزلوں کو جگہ دی گئی ہے۔ غزل کے روایتی فارم میں اپنی بات اپنے لہجے میں کہنا خاصا مشکل کام ہے لیکن گلزار کی طبیعت کی روانی کے آگے غزل کی رسمیات باندھ باندھنے میں ناکام رہی ہیں۔ غالب نے کہا تھا: رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ غزل کی بندشوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ گلزار کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نیند میں کوئی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے
کال کنویں میں گونجتی ہے آواز کسی سودائی کی

گرم لاشیں گریں فصیلوں سے
آسماں بھر گیا ہے چیلوں سے

یادوں کی بوچھاروں سے جب پلکیں بھیگنے لگتی ہیں
سوندھی سوندھی لگتی ہے تب ماضی کی رسوائی بھی

کال کنویں میں کسی سودائی کی آواز کا گونجنا، فصیلوں سے گرم لاشوں کا گرنا اور یادوں کی بوچھاروں کے اثر سے ماضی کی رسوائی کا سوندھا سوندھا لگنا ایسی تعبیرات ہیں جو اپنی ندرت کی خود گواہی دے رہی ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ تروینیوں پر مشتمل ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جیسا کہ پیش لفظ میں محترم قاسمی صاحب نے لکھا ہے تین تین مصرعوں پر مشتمل مختصر نظموں کا رواج آج کل عام ہو گیا ہے۔ ہائیکو، ثلاثی، ماہیا مختلف ناموں سے سہ مصرعی نظمیں لکھی جا رہی ہیں لیکن قاسمی صاحب کا خیال ہے، اور اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں، کہ عام طور پر ان اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا اس سماجی اور ثقافتی پس منظر کو ملحوظ نہیں رکھتے جو ان کی معنویت کا سرچشمہ رہا ہے۔ گلزار نے تروینی کی تشکیل جس حوالے سے کی ہے وہ ہم سب کے لیے جانا پہچانا ہے اور اسی لیے ان کی تروینیاں زیادہ قابلِ قبول نظر آتی ہیں۔ نمونتاً دو تروینیاں ملاحظہ کریں:

زمین اس کی، زمیں کی یہ نعمتیں اس کی
یہ سب اسی کا ہے، گھر بھی، یہ گھر کے بندے بھی
خدا سے کہیے کبھی وہ بھی اپنے گھر آئے

تمام صفحے کتابوں کے پھڑ پھڑانے لگے
ہوا دھکیل کے دروازہ، آگئی گھر میں
کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو

گلزار نے اپنے گرد و پیش کی فضا کو آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنے ماحول کی ناہمواریوں کو دردمند دل کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ وہ جس دنیا میں جی رہے ہیں، اس سے پوری طرح باخبر ہیں اور یہی باخبری اس دنیا سے ان کی بے اطمینانی کا سبب ہے۔ میرے نزدیک اُن کے شاعرانہ جذبات احساسات کو تحریک اسی بے اطمینانی سے ملتی ہے جس سے وہ اکثر دوچار رہتے ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار وہ بول چال کی عام زبان میں کر دینے پر قادر ہیں۔ اپنے موضوعات بھی انھوں نے روزمرہ زندگی کے عام واقعات سے اٹھائے ہیں مگر ان میں وہ کچھ ایسے پہلو تلاش کر لیتے ہیں جن تک رسائی کے لیے ایک درّاک ذہن اور جزرس نظر کی ضرورت ہے۔ اپنی شاعری میں وہ اپنے انفرادی تجربات ہی پیش کرتے ہیں مگر ان کا انداز پیشکش انفرادی تجربے کو اجتماعی تجربے میں بدل دیتا ہے۔ وہ شاعری کی سماجی معنویت کے قائل نظر آتے ہیں مگر برہنہ گفتاری کے نہیں جو شاعری کی سماجی معنویت پر زور دینے والے بعض شعرا کا خاصہ رہا ہے۔ گلزار چونکہ افسانہ نگار بھی رہے ہیں اس لیے کہیں کہیں ان کی نظموں میں افسانوی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ بعض نظمیں فلم سے ان کی وابستگی کی بھی غماز ہیں۔

گلزار نے فنی سطح پر کچھ ایسی آزادیاں اپنے لیے روا رکھی ہیں جنھیں ان سے پہلے بھی بعض شعرا نے گاہے بگاہے روا رکھا ہے مثلاً بحروں کے بعض ارکان کو توڑ دینا، سببِ خفیف کو حذف کر دینا یا بڑھا دینا وغیرہ۔ لیکن گلزار نے ایسا تواتر کے ساتھ کیا ہے۔ نظموں میں اسے ان کی ترجیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر آزاد نظمیں کہی ہیں جن میں ان کا یہ اصرار چنداں گراں نہیں گزرتا لیکن کہیں کہیں تروینی میں بھی انھوں نے اسے روا رکھا ہے۔ اگر ایسا انھوں نے دانستہ کیا ہے تو بہتر ہو کہ وہ اپنے موقف پر مکرر غور کریں اور اگر ایسا نادانستہ ہوا ہے تو انھیں ایسے مقامات پر نظرثانی کر لینی چاہیے۔ یہاں

صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

سامنے آئے مرے، دیکھا مجھے، بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر
کل کا اخبار تھا، بس دیکھ لیا، رکھ بھی دیا

دوسرے مصرعے میں لفظ خاطر کا دوسرا ٹکڑا 'طر' وزن سے نکل گیا ہے۔

بے لگام اڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
میکسیکن فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے
تھان پر باندھی نہیں جاتیں کبھی خواہشیں مجھ سے

'سے' کا لفظ زائد ہے۔

بعض جگہ کچھ لفظ غلط تلفظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں، وہ بھی کھٹکتے ہیں اور ایک باذوق قاری کو بدحظ کر سکتے ہیں۔

اچھی شاعری کی کمیابی کے موجودہ ماحول میں "رات پشیمنے کی" ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جسے خوش آئند بشارتوں کا نقیب قرار دیا جاسکتا ہے۔

•

محقق غالب کالی داس گپتا رضا

مرتبین: محمد عارف خاں، ثاقب صدیقی

152 صفحات، -/80 روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو ہند، راؤز ایونیو، نئی دہلی-2

مبصر: شبنم آرا

"محقق غالب کالی داس گپتا رضا" مشہور و ممتاز اہل قلم کے علمی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے جسے محمد عارف خاں اور ثاقب صدیقی نے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا ماہر غالبیات کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ غالبیات کے سلسلے میں ان کا بڑا کارنامہ "دیوان غالب کامل" کی ترتیب و تدوین ہے جس میں انھوں نے غالب کے اردو کلام کو بہ لحاظ زمانۂ تخلیق ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا حرف آغاز ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے جس سے رضا صاحب کی شخصیت، افکار و نظریات، اور علمی و ادبی رجحان سے بہ خوبی آگاہی ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی کام پر شین۔ کاف۔ نظام اور ضیاء الدین اصلاحی کے مضامین شامل ہیں۔ عام طور پر کم معروف شعرا کے اشعار مشاہیر شعرا کے کھاتے میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً شعر تو مشہور ہو جاتے ہیں لیکن ان کے خالق گمنامی میں کھو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میر تقی کے حوالے سے سنتے آئے ہیں۔ رضا صاحب کی تحقیق کے مطابق اس کے خالق بالاجی ترمبک تانک ذرہ برہانپوری ہیں۔ یہ شعر بھی:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب کبھی گردن جھکائی دیکھ لی

میر تقی میر سے منسوب ہے اور ثانی مصرع میں "کبھی" کی بجائے "ذرا" پڑھا جاتا ہے۔ رضا صاحب کی تحقیق کے مطابق شعر بجائے میر کے مصحفی کے شاگرد موجی رام موجی کا ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں شین۔ کاف۔ نظام اور ضیاءالدین اصلاحی نے اپنے مضامین میں دی ہیں۔

یوسف ناظم اپنے مضمون میں رضا صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "محقق حضرات عام طور پر رفتہ رفتہ خشک مزاج بلکہ تنک مزاج ہو جاتے ہیں، لیکن گپتا صاحب کو شاید ان کی شعر گوئی اور سخنوری نے اس وحشت سے بچائے رکھا، ان کی حس مزاح تیز بھی تھی اور تند بھی۔" رفعت سروش نے رضا صاحب کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ شفیقہ فرحت کی تحریر رضا صاحب کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے رضا صاحب کی ادبی خدمات کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی تمام شعری تخلیقات اور نثری مطبوعات کی فہرست تیار کی ہے نیز ان کے قدردانوں نے ان کی زندگی میں ان پر جو مضامین اور کتابیں شائع کیں تھیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ابوالفیض سحر نے رضا صاحب کی حب الوطنی کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد فاروقی نے رباعیات میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ نامی انصاری، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، ناصر الدین انصار اور ڈاکٹر فرزانہ نسیم کے مضامین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ رضا صاحب کا نام ماہرینِ غالبیات میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہم عصروں کی نظر میں رضا صاحب کا مقام کیا ہے؟ اس کا جواب مانک ٹالا، رضوان احمد، محمد ایوب واقف، شمیم طارق، ذکاء الدین شایاں، اور تسلیم غوری بدایونی کی تحریروں سے مل جاتا ہے۔

رضا صاحب کے متعدد مکاتیب کو بھی ثاقب صدیقی نے کافی محنت سے اکٹھا کیا ہے۔ رضا صاحب کی وفات پر لوگوں کے تاثرات کو بعنوان "کالی داس گپتا رضا اہلِ قلم کی نظر میں" محمد عارف خاں نے ترتیب دیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن خاں عطا، شان الحق حقی، شعیب مرزا شیر کوٹی، درد ہوشیارپوری، عبدالاحد ساز، کوثر امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

•

مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک / ڈاکٹر محمد کاظم

160 صفحات، -/100 روپے
ناشر: تحقیق کار پبلشرز B-104 میاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی-92
مبصر: ایس۔ اے۔ رحمٰن

اردو میں اسٹیج اور تھیٹر کے بارے میں مواد کم ہی ملتا ہے۔ برسوں پہلے عبدالعلیم نامی نے اردو تھیٹر پر کام کیا تھا اور اپنی تحقیق کی اساس پر چند کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ اردو تھیٹر پر وہ ابتدائی کام تھا اس لیے اس کام کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ پچھلے چند برسوں میں چند ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اسٹیج اور تھیٹر کے علاوہ تھیٹر کے بنیادی عنصر ڈراما کے بارے میں ہیں۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے اس موضوع پر قلم آزمائی کی ہے جسے ادبی موضوعات سے کبھی جوڑا ہی نہیں گیا، اگرچہ زندگی کے حقائق سے آگاہی بہم پہنچانے اور مسائل سے جوجھنے کے لیے نکڑ ناٹکوں نے بڑا کام کیا ہے۔ بہت پیچھے تو نہیں جاؤں گا، صفدر ہاشمی کی یاد میں قائم کیے جانے والے ٹرسٹ صہمت کا حوالہ دوں گا جس نے پچھلے چند برسوں میں نکڑ ناٹک، مختلف مسائل پر رائے عامہ ہنانے کے لیے دلی کے مختلف علاقوں میں پیش کیے۔ اگرچہ نکڑ ناٹک کا چلن کم ہے لیکن یہ سچ ہے کہ نکڑ ناٹک ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ نکڑ ناٹک کا آغاز احتجاجی پروپیگنڈہ ناٹک سے ہوا اور پھر یہ عوامی مسائل پر حکومت وقت کی توجہ مرکوز کرانے کا ذریعہ بھی بن گیا۔ حکومت نے اگرچہ نکڑ ناٹک کو اپنے خلاف پروپیگنڈہ سمجھا اور اسے بند کرنے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن اس کی اہمیت کو مانتے ہوئے حکومت بھی اب اپنے اہم پروگراموں کی تشہیر کے لیے اس وسیلے کا سہارا لینے لگی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہو یا خواندگی کی اہمیت سامنے لانے کا، ایڈز کے نتائج بد سے آگاہ کرنا ہو یا ڈرگس کی خوفناکی سامنے لانی ہو یا پھر جہیز کی لعنت کے بارے میں بتانا ہو تو نکڑ ناٹک سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح گلی گلی محلے محلے میں لوگوں کو معلومات مل جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد کاظم کی یہ کتاب اگرچہ مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک تک محدود ہے لیکن اس میں ہندستان میں نکڑ ناٹک کی روایت کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ کتاب صرف تین ابواب پر مشتمل ہے لیکن موضوع کے تعلق سے بھرپور معلومات ان میں سموئی گئی ہے۔ پہلا باب، مشرقی ہند میں اردو ڈرامے کی روایت ہے۔ اس باب میں اردو ڈرامے کے ارتقا، پھیلاؤ اور زوال پر گفتگو ہے۔ بنگال ایک زمانے میں اردو ڈرامے کا مرکز تھا جسے پارسی تھیٹر نے ختم کر دیا۔ دوسرا باب، ہندستان میں نکڑ ناٹک کا آغاز اور ارتقا ہے۔ اس باب میں مصنف نے اپنے موضوع کے بارے میں وافر معلومات مہیا کی ہے۔ ٹی وی سیریل نکڑ کو نکڑ ناٹک ہی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس سیریل میں عام لوگوں کے مسائل اور ضرورتوں کو ہی اساس بنایا گیا ہے۔ تیسرا باب کتاب کا اصل موضوع یعنی مشرقی ہند میں نکڑ ناٹک کی روایت اور اردو نکڑ ناٹک ہے۔ اس باب میں نکڑ ناٹک کے ارتقا اور پھیلاؤ کے ساتھ نکڑ ناٹک کی تکنیک اور ضرورتوں جیسے کرداروں کے لیے لباس، میک اپ اور مکالموں کی زبان اور لہجوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک اچھی اور معتبر کوشش ہے۔ آخر میں کتابیات کے تحت، کتابوں کی وہ فہرست ہے جن سے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔ اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی کی کتابیں اس فہرست میں شامل ہیں جو موضوع سے مصنف کے لگاؤ اور دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔

•

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں

سید سلیمان ندوی
78 صفحات، -/50 روپے
طابع وناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-6

سید سلیمان ندوی کا یہ طویل مضمون ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ میں مئی تا دسمبر 1918 میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، مضمون میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مقامی ہندوؤں کے رویوں اور طرز معاشرت میں آئی تبدیلیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ آپسی روابط، تعلیمی صورت حال، علم و ہنر کے پھیلاؤ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ مضمون کی اہمیت تاریخی نوعیت کی ہے۔

•

خوابوں کے مسیحا (افسانوی مجموعہ) / نعیم کوثر

188 صفحات، -/150 روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

20 افسانوں پر مشتمل نعیم کوثر کے اس مجموعے کا تعارف پروفیسر ظفر احمد نظامی، اخلاق اثر اور ایم رفیق نے اپنے مضامین میں کرایا ہے جو شامل کتاب ہیں۔

نعیم کوثر صاحب بارہ سال کی عمر سے لکھ رہے ہیں۔ ریڈیو سے وابستہ ہونے کے سبب ریڈیائی ڈرامے بھی انھوں نے لکھے۔ خوابوں کا مسیحا ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ کچھ افسانوں کے عنوانات ہیں — ریلوے والے پیر، الہ الدین کا چراغ، نئے آدم کی چتا، کوہ قاف کا شہزادہ، اپاہج یاترا، وقت کی یلغار، خوابوں کے مسیحا، نئی الف لیلیٰ، بھوکتے رہو وغیرہ۔

•

نیتا بیری

بچوں کا گوشہ

دریا کا گیت

اونچی پہاڑی وادی میں گرمیوں کا موسم تھا۔ گھونگھرو نے ایک لمبی سی سانس لی۔ اور پھر جب اُس نے اپنے گھونگھریالے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا تو اُس کی پائلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہ لہراتی بل کھاتی احتیاط سے اپنا راستہ بناتی اونچے پہاڑ کی پگھلتی برف سے باہر آ گئی۔

اس میں واقعی کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ چھوٹی سی پہاڑی ندی گھونگھرو کہلاتی تھی کیوں کہ یہ ہمیشہ ناچتی گنگناتی رہتی تھی۔ خوش و خرم، اتنی بڑی دنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لیے بے چین اور بیتاب۔ اونچے پہاڑ کے چکنے پتھروں پر کودتی اچھلتی، دل ہی دل میں گنگناتی۔

"بالوں میں میرے سورج سجا ہے
ہونٹوں پہ ہے ایک گیت
رستے میں آئیں جتنی چٹانیں
چلتے رہنا میری ہے ریت"

اونچے چناروں کے کے پاس سے جب وہ تیزی سے گزرتی تو ایسی سرسراہٹ ہوتی جیسے پیڑ اُسے جھک کر الوداع کہہ رہے ہوں۔

ٹھنڈی ہوا اُس کے کانوں میں سیٹی بجاتی اور کہتی "سنبھل کر، سامنے بڑی سی چٹان ہے۔"

خوشی سے کل کل کرتی ننھی گھونگرو چھینٹے اڑاتی، بڑی سی چکنی چٹان پر چڑھ جاتی اور جھرنے کی طرح بہنے لگتی۔

وہ اپنے قدم تیز کر دیتی اور پتھریلے پہاڑی ڈھلان میں اپنے لیے ایک الگ پتلا سا راستہ کاٹ لیتی۔

"رکو گھونگرو رک جاؤ! ہم بھی تمھارے ساتھ آ رہے ہیں۔" اُس کے راستے میں آنے والے چھوٹے بڑے پتھر چلاتے۔

"آنا ہے تو بس ساتھ آ جاؤ میں رک نہیں سکتی۔ ہمیں ابھی بہت—بہت سارا راستہ طے کرنا ہے۔ وہ خوشی سے گنگنا کر کہتی اور انھیں تیزی سے اُٹھا کر چلنے لگتی کیوں کہ وہ جوان اور طاقت ور تھی۔

وہ سب ساتھ اُچھلتے کودتے، اونچے پہاڑ کے دامن میں سورج کی روشنی میں نہائی لمبی چوڑی وادی میں پہنچ جاتے۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب گھونگھرو اونچی وادی میں الگ تھلگ اپنے گھر سے دور نکلی تھی۔ اور اُس نے اپنے ہمیشہ کے ساتھی خاموش صنوبر اور چنار کے پیڑوں کو چھوڑا تھا۔

جب برف سے ڈھکی پیاری سفید سفید چوٹیاں اُس کی نظروں سے اوجھل ہوئیں تو ایک لمحے کے لے اُسے دل میں کچھ درد سا محسوس ہوا۔ مگر ساری یادوں کو جھٹک کر پیچھے دیکھے بناوہ طوفانی رفتار سے ہرے بھرے گھاس کے میدانوں میں بڑھتی چلی گئی جہاں جنگلی پھول اشارے کر کے اُسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ کنکر اور پتھر جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی، خوشی سے پاگل ہو کر چلائے۔ اور اُس کے گانے میں شامل ہو گئے۔

"ہری بھری وادیوں میں اچھلتے کودتے

ہم آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں

اپنا میٹھا گیت سناتے ہیں"

اور خوشی سے ہلکورے لیتی گھونگرو ڈھلانوں پر آہستہ آہستہ بہتی آگے بڑھ گئی کبھی دھوپ میں ہرے بھرے شاداب سیب کے پیڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ اپنے آپ کو پھیلا لیتی، کبھی دور اونچے آسمان پر اڑتے سنہری عقاب کو دیکھ کر اُچھل کر ہاتھ ہلاتی۔

پہاڑ سے نیچے تک آنے کے اس تیز رفتار سفر سے گھونگھرو تھک گئی۔ اُس کی سانس پھول گئی۔ اُس نے قدم کچھ آہستہ کر دیے۔ کچھ دیر رک کر دور دور تک پھیلے میدانوں میں کاہلی کے ساتھ چرتی گائے بھینسوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں دکھنے لگے تھے۔ اب کنکر پتھروں کو اٹھا کر چلنا بھی اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"معاف کرنا، مجھے افسوس ہے اب مجھے تمھیں پیچھے چھوڑنا پڑے گا۔" اُس نے کچھ بڑے پتھروں سے کہا کیوں کہ میں اب جوان اور طاقت ور نہیں رہی ہوں۔ اُس کی پتلی دبلی، نازک سی کاٹھی بھی اب ختم ہوتی جارہی تھی۔ اب وہ اچھی خاصی چوڑی اور پھیلی ہوئی سی ہوتی جارہی تھی۔ اب تو اُس کی رفتار بھی کافی سست ہوتی جارہی تھی۔

بڑے پتھروں نے پیچھے چھوٹ جانے کا برا نہیں مانا۔ اتنی تیزی سے نیچے اترنے میں، اونچی نیچی وادیوں سے سیدھی سطح تک پہنچنے میں وہ اتنے اُچھلے کودے تھے اور اتنی چوٹیں کھائی تھیں کہ تھک گئے تھے۔ اُس کے علاوہ پڑے پڑے دھوپ سینکنے کے لیے گرما گرم سوج موجود تھا۔ دیکھنے کو ننھے منے پیارے بچے تھے جو گیلے گیلے کنارے پر اچھلتے کودتے شور مچاتے کھیلتے رہتے۔

مگر چھوٹے کنکر اور ریت کے ذرّے جو اُس کے ساتھ پہاڑوں سے یہاں تک آئے تھے، وہ درخواست کرنے لگے "اے گھونگھرو! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہم بھی نیلا سمندر دیکھنا چاہتے ہیں۔" کیوں کہ لمبے سفر کے دوران گھونگھرو اکثر ان کا دل بہلانے کے لیے انھیں خوبصورت سمندر کی وہ کہانیاں سناتی آئی تھی جو اُس نے کسی سے سنی تھیں، وہ نیلا سمندر جو اتنا بڑا ہے ——اتنا بڑا کہ اُس کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتے۔ تو پھر وہ کنکر پتھر اور ریت ساتھ ہی رہے اور ہموار میدانوں میں بل کھاتا راستہ بنا کر آگے بڑھنے لگے۔

گھونگھرو اب ایک بوڑھی عورت تھی۔ اُس کی گھنٹیوں کی تیز جھنکار بھی اب کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔ اُس کے گھونگھریالے بال اب سیدھے ہو گئے تھے اور ان میں کہیں کہیں چاندی سی جھلکنے لگی تھی۔ وہ اب خوب چوڑی اور بھاری بھی ہو گئی تھی۔

وہ شہر شہر، گھاٹ گھاٹ پھرتی رہی تھی۔ جہاں اُس کا صاف ستھرا شفاف پانی بھی گندا اور مٹ میلا ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور ڈونگیاں اُس کے ہلکے ہلکے بہتے پانی میں چکر لگاتے تھے۔ اُس کے چوڑے چوڑے کناروں پر مچھیرے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ننگ دھڑنگ لڑکا اُس کی خاموش گہرائیوں میں بے دھڑک چھلانگ لگا دیتا۔

لگتا تھا اب آگے بڑھنا اور مشکل ہو گیا ہے۔ ہر قدم پر وہ ایک تیز درد سے کراہتی تھی۔ ننھے ننھے کنکر جو وہ ساتھ لائی تھی، بہت پہلے ہی گھس گھسا کر چھوٹے چھوٹے ریزے بن چکے تھے۔ مگر اب تو اُس کے کمزور ہاتھوں کے لیے وہ بھی بہت بھاری تھے۔ آہستہ آہستہ وہ سب زمین میں تہہ پر جمنے لگے۔ گھونگھرو کراہ اٹھی، کیوں کہ کنکروں کے اُس ٹیلے کو ہلانے کی اب اُس میں طاقت نہیں تھی۔ مجبوراً اُس کا پانی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ گیا۔

دور نیلا سمندر چمک رہا تھا۔ اُس کے اپنے تصور سے بھی زیادہ بڑا چوڑا، اشارے کر کے اُسے اپنے پاس بلاتا، خوش آمدید کہتا سمندر۔ اُس کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ مسکرائی اور ایسی سرگوشی میں جو سنائی بھی نہ دے، گانے لگی۔

"آ گیا میرا گھر
یہ سمندر ہی تو میرا گھر ہے
میرے پیروں کی پائل اپنا آخری گیت گا لے"

اور پھر اُس کا پانی سمندر کے پانی سے مل گیا اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔

("چوبیس مختصر کہانیاں" سے ایک کہانی)

مترجم: عارف نقوی

یو پی رابطہ کمیٹی، علی گڑھ میں قائم قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر کا تقسیم اسناد کا جلسہ 12/اپریل 2002 کو منعقد ہوا۔
تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور جناب امان اللہ خاں

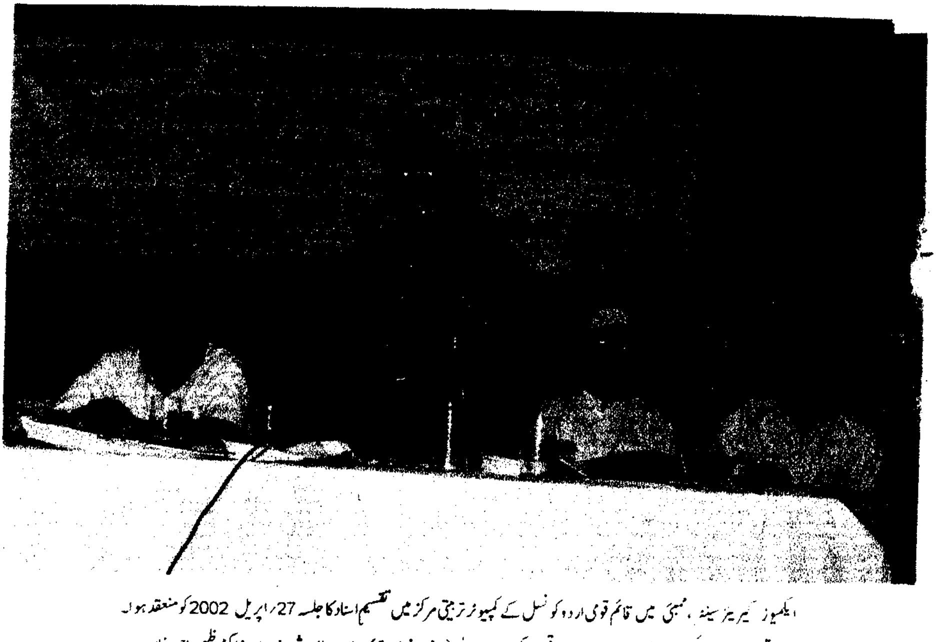

ایلمیوز کیریئر سینٹر، ممبئی میں قائم قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر تربیتی مرکز میں تقسیم اسناد کا جلسہ 27/اپریل 2002 کو منعقد ہوا۔
تصویر میں (بائیں سے) جناب یامین فاروقی، ڈاکٹر رحمت اللہ (سینٹر انچارج)، جناب طاہر شریف اور ڈاکٹر ظہیر احمد خاں

URDU DUNIYA Monthly, June 2002, Vol. 4, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

جنوبی ہند کی تاریخ
مصنف: کے۔ اے۔ نیل کنٹھ
مترجم: آر۔ کے۔ جھنجھر
صفحات [illegible]، قیمت 114

دکنی نثر کا انتخاب
مرتبہ: سیدہ جعفر
صفحات 108، قیمت 45

سخنورانِ گجرات
مرتب: سید ظہیر الدین مدنی
صفحات 440، قیمت 27

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ
مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر
صفحات 824، قیمت 157

قطب مشتری
مصنف: اسد اللہ وجہی
(چوتھا ایڈیشن)
صفحات 234، قیمت 48

کلیاتِ سراج
سراج اورنگ آبادی
مرتب: عبد القادر سروری
صفحات 782، قیمت 138

دیوانِ حسرت عظیم آبادی
مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی
صفحات 484، قیمت 100

رباعیاتِ انیس
مصنف: علی جواد زیدی
صفحات 383، قیمت 85

مثنوی بہرام و گل اندام
طبعی گولکنڈوی
صفحات 230، قیمت 60

نوٹ:۔ طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066. Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel.: 6103381, 6103938